www.paksociety.com
ماہنامہ
داستانِ دل
ساہیوال
رمضان مبارک
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

نظم کے الفاظ	تحریر
جی چاہتا ہے	محمد شعیب
سنو!	انس
تم مجھے مجھ سے	نادیہ خان
تیرے گھر تک	محمد ارسلان
محبت وفا نہیں کرتی	لاڈو جٹ
سایہ میرا	رانا ظفر اقبال
عید آئی	جاوید خان
حمد	عامر شہزاد
لڑکی باتیں کرتی ہے	ارشد محمود
اک لڑکی تھی	مون کنول
سانحہ لاہور	فاطمہ عبدالخالق
عید مبارک	کنول خان
بچپن	اقراء سیف
میں زندگی کی شاہوں	جیا بیری
اک معصوم سی لڑکی	مہوش ملک
آزاد نظم	عطاالرحمن
دیکھ لینا	میاں ارسلان
پنچھیوں کو کہاں جانا ہے	حمیرا نوشین
دوست کیا خوب	ثریا محمد حسنین

لیاقت علی بلوچ شہید تیری عظمت کو سلام

رانا ظفر اقبال

روزہ دار پر اللہ کا انعام

محمد شہزاد

حصہ غزلیات

رمضان تبسم	خدیجہ کشمیری	عروج فاطمہ
سیف الرحمن	صدام فدا	رانا سحر
منظور اکبر	محمد خاں انجم	بشریٰ الطاف
حمیرہ نوشین	عنبرین اختر	مسکان احمد
زینب ملک	سارا خان	شازیہ کریم
نزہت جبین	شیراز احمد	دانش انقلابی
ندیم عباس	عارف علی	

خط و کتاب کا پتا: ندیم عباس ڈھکو۔ چک نمبر L 5/79۔ ڈاکخانہ L 5/78۔ ساہیوال

موبائل نمبر: 03225494228

Email: Abbasnadeem283@gmail.com

Edited by: Muhammad Shoaib

ماہنامہ داستان دل ساہیوال

چیف ایڈیٹر نزہت جبیں ضیاء

ایڈیٹر ندیم عباس ڈھکو 0322-5494228

فیس بک انچارج: مہوش ملک، محمد شعیب، عمران رضا بٹ

مجلس ادارت: رانا ظفر علی 0300-4229969 — رانا شعیب عالم 0336-7685168 — رمضان تبسم پریمی 03089045689

اپنی تحریریں اس پتہ پر ارسال کریں۔ ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 79/5.L ڈاکخانہ 78/5.L ساہیوال۔

ماہ جون 2016ء

شام تنہائی

قسط نمبر 3 — تحریر: ندیم عباس ڈھکو 0322-5494228

وہ ہاتھ کہنی کی طرف سے مڑا ہوا تھا اور بازو سے چپک گیا تھا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ تیرا ہاتھ کیسا ہو گیا ہے؟" وہ اس کے ہاتھ کو پکڑ کر سیدھا کرنا چاہتا تھا۔ راج محمد نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔ "یہ سیدھا نہیں ہوگا۔ کلائی اور بازو کی کھال ایک دوسرے سے چپک گئی ہے۔" اس نے تعجب سے پوچھا۔ "مگر یہ ہوا کیسے۔۔۔؟" وہ بتانا چاہتا تھا کہ سندس کا نام تیزاب سے مٹاتے وقت تکلیف کی شدت سے ہاتھ مڑ گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح ہاتھ رکھے تکلیف کو برداشت کرتا رہا۔ جب اسے سیدھا کرنا چاہا تو پتا چلا کلائی سے کہنی تک کی کھال بازو سے چپک گئی ہے۔ اب وہ اسے الگ کرنا چاہے گا تو بازو کی کھال بھی ادھڑنے لگے گی۔ وہ بہت کچھ بتانا چاہتا تھا مگر سندس کا خیال آتے ہی تڑپ کر بولا۔ "یا خدا۔۔۔ اپنا نہیں وہ کیسی ہوگی؟" وہ تیزی سے اسکول کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ رزاق نے اسے روکنا چاہا لیکن جانتا تھا وہ دیوانہ نہیں رکے گا۔ پھر اسے اپنے گھر والوں کی بھی فکر تھی۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ راج محمد اسکول کے قریب پہنچتے پہنچتے ایک دم سے رک گیا۔ پریشانی سے ادھر دیکھنے لگا۔ اسکول کی وہ عمارت کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح گھوم گھوم کر اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "سندس۔۔۔ سندس کا سکول۔۔۔؟ وہ اسکول کہاں گیا؟" اسکول کے ملبے سے کتنی ہی طالبات کے رونے اور کراہنے کی آوازوں نے اسے متوجہ کیا۔ وہ ادھر دیکھنے لگا۔ پھر لپک کر اس طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "وہ اسکول کے ملبے میں ہوگی۔" کتنے ہی لوگ وہاں دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ان کے ساتھ طالبات کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ادھر سے ادھر دوڑتا ہوا ملبے میں جھانک کر سندس کو تلاش کرنے لگا۔ چھتیں اور دیواریں یوں گری ہوئی تھیں کہ وہاں لڑکیوں کے ہی زندہ بچنے کی توقع تھی۔ کسی کے ہاتھ کسی کے پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔ چھت کے اور دیواروں کے بڑے بڑے چٹانی ٹکڑوں کو ہٹانا انسانی ہاتھوں کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ہتھوڑوں سے پتھروں اور چٹانوں کو توڑنا چاہتے تھے۔ لیکن نیچے دبی ہوئی لڑکیاں تکلیف سے چیخنے لگتی تھیں۔ بڑی دیر بعد پتا چلا کہ وہاں صرف دو چار ہی زندہ ہیں اور ان میں سندس نہیں تھی۔ اس کا ایک پڑوسی اپنا سر پیٹتا اور بال نوچتا آ رہا تھا۔ راج محمد کو دیکھ کر بولا۔ "کچھ نہیں بچا۔ نہ جان بچی نہ مال بچا۔ تمہارے گھر کی دیواریں بھی بیٹھ گئی ہیں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" عشق بہت ہی خود غرض ہوتا ہے۔ معشوق کے آگے ساری دنیا کو بھلا دیتا ہے۔ پڑوسی نے کہا تو گھر والوں کی یاد آئی۔ وہ تیزی سے ادھر دوڑتا چلا گیا۔

☆☆☆

ملبے کو ہٹاتے ہٹاتے سندس کے ہاتھ شل ہو گئے تھے۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ اتنی محنت کے بعد کسی حد تک کامیابی ہوئی تھی۔ باہر نکلنے کا راستہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل سکتی تھی۔ مگر ماں کو چھوڑ کر باہر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اسے پیدا کرنے والی جہاں پڑی ہوئی تھی وہاں تک وہ شگاف سے گزر کر نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے جسم کا نچلا حصہ ایک چارپائی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ وہ ایسی حالت میں تھی کہ خود اپنے وجود کو گھسیٹ کر بیٹی کے پاس نہیں آ سکتی تھی۔ لوہے کی چارپائی نے ایک شکستہ دیوار کو روکا ہوا تھا۔ وہ عارضی سہارا کسی بھی وقت ساتھ چھوڑ سکتا تھا۔ سندس تھوڑی دیر تک ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ ماں کو بچانے کی تدبیر سوچتی رہی۔ پھر اوندھی لیٹ گئی اپنے دونوں ہاتھوں کو اس شگاف سے گزار کر ماں کی بغلوں میں پھنسا کر اسے کھینچتے ہوئے بولی۔ "ذرا ہمت سے کام لو۔ میں تمہیں کھینچ رہی ہوں۔ تم بھی نکلنے کی کوشش کرو۔۔۔ ہاں۔ ہاں ذرا اور۔۔۔ بس ذرا اور۔۔۔ ابھی یہاں سے نجات مل جائے گی۔" وہ دونوں اپنی ہی کوششیں کر رہی تھیں۔ ان کی اس حرکت نے چارپائی کو ہلا دیا تھا۔ ماں کے چہرے سے تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے دونوں پاؤں چارپائی کے نیچے یوں دبے ہوئے تھے کہ وہ انہیں نکال نہیں پا رہی تھی اور اوپر پڑا ہوا ملبہ دھمکیاں دے رہا تھا اب تب میں گرنا چاہتا تھا۔ خود سندس کے آس پاس ملبہ اس طرح چھایا ہوا تھا کہ کسی بھی لمحے میں زیر و زبر ہو سکتا تھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں کھینچ رہی ہوں۔ تم پاؤں نکالنے کی کوشش کرو۔" ماں کے وجود کو کھینچنا آسان نہیں تھا۔ دونوں ہاتھ پہلے ہی ملبے کو ہٹاتے ہٹاتے مارے تھکن کے بے جان سے ہو رہے تھے۔ پھر بھی وہ بڑی ہمت سے کام لے رہی تھی۔ ماں گھٹنوں تک چارپائی کے نیچے سے نکل آئی تھی۔ سندس اسے اپنی طرف کھینچتی تھی تو پورے وجود کو ایسی تکلیف ہوتی تھی کہ ماں کی آہیں اور کراہیں دل کو تڑپانے لگتی تھیں۔ وہ سخت اذیت سے گزر رہی تھی۔ سندس اس کی تکلیف کو سمجھ رہی تھی۔ زار و قطار رو رہی تھی۔ آخر کیا کرتی؟ اسے باہر نکالنے کی اور کوئی تدبیر بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ماں نے بے بسی سے انکار میں سر ہلایا۔ یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ چارپائی نے ٹوٹی ہوئی دیوار کو روک رکھا ہے۔ وہ ماں کھینچتی ہے تو چارپائی ہلتی ہے اور دیوار بھی اپنی جگہ سے سرکنے لگتی ہے۔ سندس نے پریشان ہو کر اس جھکی ہوئی شکستہ دیوار کو دیکھا۔ وہ جیسے کسی آسیب کی طرح بازو پھیلائے ماں کے وجود پر گرنے کی تیار تھی۔ اب چارپائی کے نیچے صرف اس کے پاؤں پھنسے ہوئے تھے۔ سندس اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے تسلیاں دیتے ہوئے بولی۔ "بس تھوڑی سی اور ہمت کر لو۔ یہاں سے نکلنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔" وہ اس کھینچا تانی میں بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ لباس لہو سے تر بتر تھا۔ بڑی دیر بعد ماں کی نقاہت بھری آواز سنائی دی۔ "لگتا ہے پاؤں ٹوٹ گئے ہیں۔ میں یہاں سے نہیں نکل پاؤں گی۔۔۔" ماں کی بات سن کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ "نہیں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم خواہ مخواہ مایوس ہو رہی ہو۔ ذرا دیر دم لے لو۔ تکلیف کچھ کم ہوئی تو پاؤں باہر نکالے جائیں گے۔" وہ تھوڑی دیر تک ماں کو تسلیاں دیتی رہی۔ پھر دونوں بازوؤں کو اس کی بغلوں سے گزار کر اسے مضبوطی سے جکڑتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں کھینچ رہی ہوں۔ تم فوراً اپنے پیروں کو نکالنے کی کوشش کرو۔" وہ سسکاری لیتے ہوئے بولی۔ "کیسے نکالوں۔۔۔؟ بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ ماں کا حوصلہ بڑھاتی جا رہی تھی اور دھیرے دھیرے اسے اپنی طرف کھینچتی جا رہی تھی۔ وہ تڑپ رہی تھی تکلیف کی شدت سے چیخ رہی تھی۔ دونوں پیروں کو چارپائی کے لوہے نے جیسے کچل کر رکھ دیا تھا۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ سنگدل بن جاتی، ماں کی تکلیف کا خیال نہ کرتی۔ تب ہی نجات مل سکتی تھی۔ اس نے یہی کیا۔ ماں کو دونوں بازوؤں میں مضبوطی سے جکڑ کر پوری قوت سے کھینچتی ہوئی پیچھے جانے لگی۔ یوں پوری طرح باہر آتے ہی شکستہ دیوار کے چٹانی ٹکڑے زوردار آواز کے ساتھ چارپائی پر آ گرے۔ آواز ایسی ہولناک تھی کہ وہ دہل کر رہ گئیں۔ پل بھر کو یوں لگا جیسے وہ قیامت خیز زلزلہ پھر ان پر قیامت ڈھانے آ گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہوش بحال ہوئے تو اس نے ماں سے کہا۔ "یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ فوراً باہر نکلو۔" اس نے جو راستہ بنایا تھا۔ وہاں سے کھڑے ہو کر تو کیا بیٹھ کر بھی گزرا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ دونوں اوندھی لیٹ گئیں۔ کہنیوں کے بل چھوٹے بڑے پتھروں پر گھسٹتی ہوئی وہاں سے گزرنے لگیں۔ جگہ جگہ سے لباس پھٹ رہا تھا۔ جسم جیسے چھلنی ہو رہا تھا۔ ان تکالیف کو جھیل کر ہی جان بچائی جا سکتی تھی اور وہ بچا رہی تھیں۔ ان لمحات میں اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک ہی بار ملنے والی زندگی کتنی پیاری ہوتی ہے؟ جب ہاتھوں سے اس کا خوبصورت ساتھ چھوٹنے لگتا ہے تب اس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ احساس ہی تھا جو ان کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ ورنہ اس تباہی سے پہلے ایسے کٹھن حالات سے گزرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ دونوں ہی بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ ملبے سے نکلتے ہی ماں پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ سندس اپنے حواسوں میں تھی۔ لیکن گرد و نواح میں دور دور تک پھیلی ہوئی تباہی اس کے ہوش اڑا رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے دیدے پھیلائے حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھے دائیں بائیں گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھی۔ اتنی بڑی تباہی کو ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔ محلے کے تمام چھوٹے بڑے مکانات مکمل طور پر منہدم ہو چکے تھے۔ ہر طرف ملبے کا ڈھیر تھا، آہیں تھیں، کراہیں تھیں کہیں کوئی بیوہ اپنے شوہر کی لاش پر ماتم کر رہی تھی تو کہیں مائیں، بہنیں اپنے عزیزوں کے بچھڑ جانے پر نوحہ کناں تھیں۔ گیت، موسیقیت اور پرندوں کی چہکار کے بجائے ہر سمت سے آہ و بکا سنائی دے رہی تھی۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ "یا میرے اللہ۔۔۔ یہ سب کیا ہو گیا؟ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں؟" پھر وہ فوراً ہی جھک کر ماں کا شانہ ہلاتے ہوئے بولی۔ "ماں جی۔۔۔ یہ قیامت صرف ہم پر نہیں ٹوٹی ہے۔ یہاں تو سارا محلہ تباہ ہو گیا ہے۔" اس نے ایک ذرا آنکھیں کھول کر بیٹی کو دیکھا۔ پھر پہلے کی طرح غافل ہو گئی۔ نبض چل رہی تھی، دل کی دھڑکنیں زندگی کا پتا دے رہی تھیں۔ سندس اسے فوراً ہسپتال لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن حالات کی ناقابل یقین صورتحال دیکھ کر بری طرح بوکھلا گئی تھی۔ گلی میں یہاں سے وہاں تک درجنوں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسے زخمی بھی نظر آ رہے تھے، جنہیں ملبے سے نکال کر گلی میں لٹا دیا گیا تھا۔ ان کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی کے لیے کوئی ڈاکٹر نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کے لواحقین فوری طور پر مرہم پٹی نہیں کر سکتے تھے۔ لہو پونچھ کر پٹیاں باندھ رہے تھے۔ اس نے پلٹ کر ماں کے زخمی وجود کو دیکھا۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اسے جلد از جلد کسی اسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ وہ وہاں سے گزرنے والوں کو دیکھنے لگی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی کسی نامحرم سے بات نہیں کی تھی۔ ایسی محدود رہنے والی لڑکیوں کو دنیا کا ہر اجنبی حملہ آور لگتا ہے۔ اس کا لباس اور پھٹا ہوا دوپٹا ایسا ہو گیا تھا کہ وہ چہرے کو اور پورے وجود کو ڈھانپ نہیں سکتی تھی۔ اب تو حوصلہ کرنا تھا۔ بے پردگی لازمی ہو گئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں ادھر سے ادھر منڈلانے لگی۔ وہاں سب ہی اپنوں کو ملبوں سے نکالنے اور انہیں کسی اسپتال تک پہنچانے کی فکر میں تھے۔ اس کے ذہن نے سمجھایا کہ اس طرح ہچکچاتی رہے گی تو ماں کی تکلیف بڑھتی چلی جائے گی۔ اس نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے ایک راہ گیر کو مخاطب کیا۔ "سنیں۔۔۔ میری ماں جی بہت زخمی ہیں۔ انہیں اسپتال لے جانا ہے۔ کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔" وہ بڑے ہی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کس ہسپتال کی بات کر رہی ہو؟ شہر کی تمام عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن گئی ہیں۔ شاید تمہیں خبر نہیں ہے ہمارا پورا مظفر آباد تباہ ہو گیا ہے۔" اس کے ذہن کو شدید جھٹکا سا لگا۔ پہلے تو اس نے یہ سمجھا تھا کہ صرف اس کا گھر ہی گر پڑا ہے۔ پھر گھر سے نکلی تو معلوم ہوا پورا محلہ تہس نہس ہو گیا ہے اور اب وہ راہ گیر اسے شہر کے حالات بتا رہا تھا۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ شہر ہی نہیں پوری دنیا تباہ ہو چکی ہے۔ ہم تو گناہ گار ہیں۔ شاید ہمیں گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ مگر بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔ انہیں کیوں سزا مل رہی ہے؟ میں نے ایک اسکول کا ملبہ دیکھا ہے۔ وہاں شاید ہی کوئی بچہ زندہ بچا ہو۔" سندس نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ تو اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ شیرو دوسرے بچوں کے ساتھ اسکول میں محفوظ ہوگا۔ لیکن دور تک زمین بوس عمارتوں کو دیکھ کر اور اس اجنبی کی باتیں سن کر یکبارگی ہذیانی انداز میں چیخ پڑی۔ "شیرو۔۔۔۔!" اس نے اجنبی سے کہا "وہ۔۔۔۔ دوسرے محلے میں ہے۔۔۔ بچوں کا پرائیویٹ اسکول ہے۔ وہ۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے نا۔۔۔؟" اس راہ گیر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے صدمے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اسکول ہے نہیں۔۔۔ تھا وہاں کی حالت بھی نہ پوچھو۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بڑی بڑی دیواروں اور کنکریٹ کی بھاری چھتوں تلے دبے ہوئے ہیں۔ جو زندہ ہیں وہ مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔ مگر دو گھنٹے گزر جانے کے باوجود وہاں سے کسی بچے کو نکالا نہیں جا سکا۔ میں تو وہاں سے منہ پھیر کر آ گیا ہوں۔ ان معصوموں کی آہیں اور سسکیاں سنی نہیں جا رہی تھیں۔" وہ دیوانہ وار دوڑتی ہوئی بھائی کے اسکول کی طرف جانے لگی۔ وہاں نہ کوئی گلی رہی تھی نہ کوئی محلہ ہر سمت منہدم چار دیواریوں کا میدان حد نظر تک دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے میں اسکول والی گلی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہاں گم ہو گئی ہے۔ کافی دیر ادھر ادھر بھاگتے رہنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ بھٹک رہی ہے۔ وہ دوڑتے دوڑتے رک گئی۔ کہاں جائے؟ کہاں ہے اسکول؟ وہ آگے پیچھے دائیں بائیں گھوم گھوم کر دیکھنے لگی۔ پیچھے ماں کو چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ راستہ بھی گم ہو گیا تھا۔ دور تک ملبوں کے ڈھیر نے راستوں کی شناخت ختم کر دی تھی۔ وہ کیسے جائے بھائی کی طرف۔۔۔؟ وہ کیسے جائے ماں کی طرف۔۔۔؟ وہاں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی انگلی پکڑ کر اسے اپنے زندوں یا مردوں کی طرف لے جاتا۔

☆☆☆

زلزلہ تو ختم ہو گیا تھا لیکن دور پہاڑوں سے بڑے بڑے چٹانی پتھر لڑھکتے ہوئے نیچے آ رہے تھے اور بستیوں کی بستیاں تباہ کرتے جا رہے تھے۔ افراتفری میں بھاگنے والی پردہ دار خواتین کے سروں سے چادریں سرک گئی تھیں۔ وہ جو گھر کی چار دیواری میں بھی بے پردہ ہونے سے گھبراتی تھیں۔ اس مصیبت کی گھڑی میں ان کے لیے حیا کا آنچل بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں گلی کوچوں میں بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ راج محمد کا دل کہہ رہا تھا شاید وہ اسکول نہیں گئی ہوگی۔ وہ دوڑتے دوڑتے ان مصیبت کی ماریوں میں اپنی سندس کو تلاش کرتا جا رہا تھا۔ راستے سے گزرتے ہوئے کتنے ہی گھروں کے ملبے کے نیچے سے کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ کہیں کوئی لرزتا ہوا ہاتھ زبان بے زبانی سے کسی ہمدرد کو پکار رہا تھا تو کہیں پکارنے والے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ ہر دو قدم کے بعد کسی نہ کسی کا لاشہ دکھائی دے رہا تھا۔ جگہ جگہ تازہ انسانی خون بکھرا ہوا۔ وہی خون جو کچھ دیر پہلے نہ جانے کس کس کی رگوں کا سرمایہ تھا؟ اب گزرنے والوں کے قدموں تلے بہہ رہا تھا۔ کوئی دیوانہ وار چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا۔ "وادی میں کوئی زندہ بھی بچا ہے یا نہیں۔۔۔۔؟" ہر دل کی دھڑکن تیز تھی۔ ہر آنکھ نم تھی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو سانسیں رکنے لگیں۔ اس ملبے کے ڈھیر کو گھر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے پیاروں کو نکالنے کے لیے کس راستے سے اندر جائے؟ وہ ماں بہنوں کو پکارتا ہوا اس ملبے کے آس پاس منڈلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنے پیچھے سے بہنوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ رانو اور زلیخا دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئیں۔ وہ اسکول یونیفارم میں تھیں۔ دھول مٹی سے اٹی ہوئی تھیں۔ چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں سے لہو بہہ رہا تھا۔ چار برس کی رانو نے روتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ابھی اسکول سے نکالا ہے۔ ہماری ساری سہیلیاں ابھی تک نیچے دبی ہوئی ہیں۔" بارہ برس کی زلیخا نے کہا۔ "میری ایک سہیلی چھت کے نیچے دب کر مر گئی ہے۔ اور کئی زندہ ہیں مگر دبی ہوئی ہیں۔ بھائی جان! وہ کیسے باہر آئیں گی؟" ہر زبان تقریباً ایک ہی جیسی داستان سنا رہی تھی۔ چھوٹی بہن رانو نے اپنے گھر کے ملبے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "امی کہاں ہیں؟ اور باجی بھی نہیں ہیں؟" زلیخا نے جیسے روتے ہوئے کہا۔ "چاچا چاچی اور بچے بھی نہیں ہیں۔۔۔۔ بھائی جان! وہ سب کہاں۔۔۔۔؟" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ راج محمد نے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ ملبے کے اندر کا سناٹا کہہ رہا تھا کوئی نہیں بچا ہے۔ وہ معصوم بچیوں کو کیا بتاتا؟ کس دل سے بتاتا؟ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو چکا ہے اور آگے کیا ہونے والا ہے؟ پھر وہ تینوں اس ملبے کو ہٹانے میں مصروف ہو گئے۔ اندازہ تھا کہ کہیں نہ کہیں سے ضرور کوئی راستہ نکل آئے گا۔ اس وقت راج محمد کو شدت سے احساس ہوا کہ عشق نے اسے اپاہج بنا دیا ہے۔ ایک ہاتھ کہنی کی طرف سے مڑ گیا تھا اور اس قدر کمزور تھا کہ اسے ہاتھ لگانے سے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ بازو تقریباً ناکارہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے پتھر توڑ کر اپنے پیاروں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ملبے میں بھاری پتھر، شکستہ ستون، چھتیں اور گھر کا دوسرا سامان تھا۔ وہ بہنوں کا ساتھ دے رہا تھا لیکن جوان بھائی ہونے کے ناتے بھرپور مدد نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے جتنا ملبہ اٹھایا جا سکتا تھا اٹھا رہا تھا۔ پڑوس کے ملبے سے تین افراد کی لاشیں نکالی جا رہی تھیں۔ انہیں گلی میں رکھا جا رہا تھا۔ اس گھر کی مائیں، بہنیں اور بزرگ ٹوٹی پھوٹی لاشوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔ وہ منظر ایسا تھا کہ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ رانو آنکھیں بند کر کے روتی ہوئی بھائی کے بازو سے لپٹ گئی۔ زلیخا بھی منہ پر آنچل رکھ کر آنسو بہانے لگی۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ موت کی خبر سنا رہا تھا۔ ابھی پڑوس کی ماتمی صدائیں مدھم نہیں ہوئی تھیں کہ پچھلے محلے سے آہ و بکا کا ایک طوفان امڈ پڑا۔ وہاں بھی کتنے ہی پیارے ہمیشہ کے لیے اپنوں سے بچھڑ گئے تھے۔ ان تینوں کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ وہ ایک دوسرے کو تسلیاں دے کر دوبارہ اس ملبے کو ہٹانے میں مصروف ہو گئے۔ سینوں میں دھماکے کرتے ہوئے دلوں سے ایک ہی سوال ابھر رہا تھا۔ "کیا وہ اپنے پیاروں کو زندہ سلامت نکال پائیں گے؟" شمالی علاقہ جات میں ہمیشہ سے مشترکہ خاندان کا دستور رہا ہے۔ ایک گھر میں درجنوں افراد رہتے ہیں۔ اس لیے ایک ایک گھر سے کئی کئی لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ کہیں کوئی زندہ نکلتا تھا تو اللہ اکبر کی صدائیں حوصلے بڑھا دیتی تھیں۔ اور کہیں کلمہ شہادت کی آواز پھر سے مایوسیوں میں غرق کر دیتی تھی۔ ملبے کے ڈھیر کو ہٹاتے ہٹاتے زلیخا ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ رانو اور راج محمد دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ ایک وزنی ستون کے نیچے خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا۔ اس ستون نے بڑی بہن کو اور چچی کو ایسے کچل ڈالا تھا کہ چہرے پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ مگر تن کا لباس پہچان بنا ہوا تھا۔ اپنے پیاروں کی موت کا یقین بڑی دیر سے ہوتا ہے۔ راج محمد انہیں چھو کر دیکھ رہا تھا۔ بہنیں کبھی بڑی باجی کو اور کبھی اپنی چچی کو پکار رہی تھیں۔ لیکن زندگی کے آثار نہیں مل رہے تھے اور نہ ہی مل سکتے تھے۔ لاشوں کی حالت ایسی تھی کہ انہیں دیکھ کر زلیخا سینہ پیٹنے لگی وہ بانہیں مار مار کر رونے لگی۔ اس ہولناک صورتحال میں حواس منتشر ہو رہے تھے۔ رانو بھی ڈگمگاتی ہوئی دونوں ہاتھوں سے سر تھامتی ہوئی گرنے کے انداز میں بیٹھتی چلی گئی تھی۔ وہاں بکھرا ہوا لہو دیکھ کر سر چکرا رہا تھا۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے لپٹ کر ماتم کرنے لگیں۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

مایوسی گناہ ہے

شعیب عالم: 0336-7685168

وہ اپنا بنا کے کیوں چھوڑ گیا
شاید ہم اس کے قابل نہ تھے

[illegible]

آپ کو قصوروار کیوں ٹھہراتے ہیں مگر ہمارا کوئی قصور نہیں ہوتا جس نے آپ کی زندگی سے جانا ہے چلے جانا ہے اور جس نے نہیں جانا وہ نہیں جاتا۔ یہ صرف ایک زندگی کے گزرنے اور وقت گزرنے کے باعث ہے۔ اگر ہم کو اس کی سمجھ آ جائے اور انسان اس کے متعلق سوچنا شروع کر دے اور اس عمل کے اوپر دماغی بوجھ کو کم کر دے۔ انسان اس چیز کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے آپ کو صرف الزام دیتا ہے۔ کہ میں ہی مجرم

[illegible]

کرے۔ بہت سے لوگ اپنے آپ کو دنیاوی خواہشات پورا نہ ہونے پر اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ خودکشی کرنے والے انسان جب کوئی زہریلی چیز کھا لیتا ہے اس کے بعد زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ آنا ناممکن سا ہوتا ہے انسان کچھ وقت کے بعد موت کی طرف جانا شروع ہو جاتا ہے پھر انسان ڈاکٹرز اور اپنے ساتھ کھڑے ماں باپ، بہن بھائی، دوست

[illegible]

مضبوط ہوگا وہ کبھی صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا کامیابی اس کا مقدر بنے گی۔ جس کا ایمان کمزور ہوگا وہی خودکشی جیسا عمل کرے گا جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔

لہو عیدیں

قسط نمبر 1 — محمد خاں انجم دیپالپور 0347-6373135

گزشتہ ہر سال کی طرح رمضان المبارک اینڈ عید الفطر کی آمد آمد ہے۔ جذباتی ریاضات کا موسم آ گیا ہے۔ انسان بہت گناہ گار ہے دل عشق اور اللہ تعالیٰ سے نسبت کا ذریعہ ہے۔ رمضان کا مہینہ، بلند رُتبت کا بہانہ ہے عید الفطر کچھ عیدیں خاص ہوتی ہیں اور بعض اوقات کچھ عیدیں سُرخ آنسوؤں کی برسات سے لہو ہو جاتی ہیں۔ بچپن لڑکپن اور جوانی آرزوں اور امنگوں کی آماجگاہ ہوتی ہے یہ سب انسان اگر اشرف المخلوقات ہے تو اُسے صرف رشتوں کو بچانے کے لیے نبھانے کے لیے یہ افضل رتبہ دیا گیا ہے اور سب سے بڑا رشتہ محبت کا ہے۔ جو دور حاضر میں شاید نا پید ہو چکا ہے۔ عید مسرت کا نام ہے لیکن کبھی کبھی یہ خوشیوں بھرے لمحات محبت کرنے والوں کو اتنا توڑ جاتے ہیں کہ پھر وہ زندگی بھر ان لمحات کے دوبارہ آنے پر لہو لہو ہونے رہے ہیں۔ میرے شہر میں یہ رونقیں کبھی ہر بشر کی کیا آرزو ہے کیسا دل نادان نے اسے چپکے سے کیسی بازاروں کی یہ سج دھج ہے انجم میری تو ہر عید لہو لہو ہے پندرہ سال پہلے بھی اسی طرح ہی ایک رمضان آیا پھر عید آئی میں کام سے تھکا ہارا جب شام کو گھر سوتا تو آج تو میرا سارا بدن دکھ رہا تھا۔ کام کافی زیادہ ہونے کی وجہ بھی تھی اور پھر جون جولائی کی ظالم گرمی بھی عروج پر تھی۔ روزہ افطار کیا نماز مغرب ادا کی ہلکا پھلکا سا کھانا کھایا بہت تھکاوٹ ہو رہی تھی لیکن پھر بھی ہمت کر کے انتہا اذان عشاء ہو رہی تھی جلدی سے وضو کیا اور مسجد چلا گیا آج تو نماز پڑھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی لیکن انسانی سوچ سے جنگ کر نماز پڑھی اور نماز تراویح بھی ادا کر ڈالی۔ رات کے دس بج رہے تھے گھر آتے ہی اپنے کمرے کی چھت پر سکون سے سونے کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن آج شاید نیند کی دیوی مجھ سے روٹھ چکی تھی۔ ہلکی ہلکی چلتی ہوا مجھے جانے کب میرے ماضی میں لے گئی۔ آنکھیں نہ برستی نہ رکتی ایک شمع تھی دل کی جو برسوں پہلے ایک عید نے ہی بجھا ڈالی تھی ہر سال ہی ان دنوں میں مجھ پر قیامت ٹوٹتی ہے۔ وہ چوڑیوں کی کھنک وہ قاتل سارنگ صدا مجھے زہر لگتی ہیں اب تو یہ لہو عیدیں زخم زخم کرتی ہیں مجھے ہر عید معلوم نہیں میں کس روش پر گامزن ہوں دن کے اجالوں میں بھی جگنو پرکھنے کی ضد کرنے لگا ہوں ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں نہ جانے کیوں میری یہ سب عیدیں لہو ہیں۔ کاش مجھے کوئی الہام ہوتا کاش میرے معصوم جذبوں کی اس قدر تقسیم نہ ہوتی جانے اپنے سامنے کتنی بجھتیں فنا ہوتی دیکھیں لیکن پھر بھی یہ دل میری دسترس میں نہ رہا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی چاہت کے سر لیے گیت اپنے منہ میں تا بیٹھا۔ دل کیوں اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ دل اور جذبوں میں آخر اتنی انفرادیت کیوں ہے؟ اب تو مجھے شہر کے رنگین بازاروں سے خوف آتا ہے۔ عید شاپنگ زہر بن کر ڈستی ہے۔ وہ حادثہ محبت میری وفا کو بھی قتل کیا جب بھی عید آتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں کسی ایسے دیس میں چلا جاؤں جہاں مجھے گزشتہ لہو عیدیں پل بھر کے لیے بھی یاد نہ آئیں تاروں بھری رات میں ہلکی ہلکی چلتی قمر نے گرم ہوا میرے زخموں کے تہہ میں کبھی انتشار نہ پھیلا سکے آنکھوں سے کبھی آنسو نہ گریں لیکن میں ٹوٹتا ہوں ٹوٹ کر بکھرتا ہوں صرف عید لمحوں میں دکھ ہمیشہ خاموش ہوتے ہیں۔ کسی کے بچھڑنے کا غم نہیں ہوتا بلکہ ان ٹوٹ جانے والے رشتوں کا ہوتا ہے جو عمر بھر کی رفاقت کے بعد پل بھی میں ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں ہاتھ میں قلم بھی یہی غم ہی تھماتے ہیں لفظوں کی تخلیقات کو یہی دکھ ہی تو روانی دیتے ہیں میں لکھ رہا ہوں مگر ہر سوچ پر پہرہ ہے کیونکہ محبت کو دکھ بہت گہرا ہے زیست کی کوئی چھن جائے تو یہی اوراق ہی تو ان دکھوں کو مداوا کرتے ہیں۔ لامحدود سوچیں احساس زیست کو اور بھی الجھا دیتی ہیں۔ غزل یار رمضان آدھے سے زیادہ گزر چکا ہے اور تم ابھی تک خاموش ہو۔ اس کا نام غزالہ تھا لیکن میں پیار سے اسے غزل کہتا تھا کیونکہ وہ میری شاعری کی دل کی گہرائیوں سے دیوانی تھی ایک دن میری ڈائری پڑھتے ہوئے اس نے میری ایک غزل پر ڈھیروں مبارک باد دے ڈالی تھی تب سے میں اسے غزل ہی کہہ کر بلاتا تھا۔ مجھے کہنے لگی انجم صاحب ابھی کافی دن پڑے ہوئے ہیں۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

دل بڑی مشکل سے ہارا ہے

قسط نمبر 2 — نزہت جبیں ضیاء

''ماں جی...... مگر......'' وصی آگے بڑھ کر گڑگڑائے۔ ''اگر مگر کی کوئی گنجائش نہیں ہے' خاموشی سے لائٹ بند کرو اور سو جاؤ۔ اب اس موضوع پر کبھی بھی کوئی بات نہ کرنا سمجھے تم......'' ہاتھ اٹھا کر واجدہ بیگم نے حتمی فیصلہ سنایا اور غصے سے کمرے سے نکل گئیں' وصی ان کی پشت کو بے بسی سے دیکھتے رہ گئے۔ یہ رات وصی کے لیے قیامت کی رات تھی جس میں نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے گھناؤنا فیصلہ کر ڈالا۔ ''کاش ماں جی...... کاش آپ مان جاتیں......'' فیصلہ کرتے ہوئے وہ بھی کئی بار ٹوٹے بکھرے مگر...... دوسری صبح حسب معمول سب سے پہلے عرفانہ خاتون نماز کے لیے اٹھیں اور باری باری سب کو جگایا اور وصی کو جگانے بھی اس کے کمرے میں آئیں تو وصی کو بیڈ پر نہ دیکھا' سمجھیں باتھ روم میں ہوگا مگر باتھ روم کا کھلا دروازہ دیکھ کر چونکیں' وصی کو آوازیں دیں مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ ''ارے کہاں جا سکتا ہے؟'' وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکلیں ادھر ادھر دیکھا' پریشان ہو کر واپس اپنے کمرے میں آ گئیں۔ ''کیا ہوا؟'' ذکی صاحب نے انہیں پریشان دیکھ کر پوچھا۔ ''وہ...... وہ...... وصی اپنے کمرے میں نہیں ہے۔'' ''ارے ماں جی کے کمرے میں ہوگا۔'' ذکی صاحب جو ابھی وضو کر کے آئے تھے تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے بولے۔ ''نہیں ہے وہاں بھی میں دیکھ آئی ہوں۔'' وہ خاصی پریشانی سے بولیں۔ ''بھابی! وصی کہاں ہے۔'' تبھی تسکین بھی آ گئیں۔ ''تقی...... ذکی...... وصی آ جاؤ دیر ہو رہی ہے۔'' بابا جان نے آواز لگائی' سارے گھر کی لائٹیں جلا کر سب جگہ دیکھ لیا مگر وصی کہیں نہ تھا۔ تقی' وصی کے کمرے سے ہو کر آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا اور چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت تھی۔ ''کیا ہوا...... کہاں ہے وصی......؟'' انعام شاہ نے پوچھا۔ ''بابا جان......'' تقی کی آواز لرز گئی ان سے کچھ بولا نہ گیا' ذکی نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ''قابل احترام بابا جان اور ماں جی! بچپن سے لے کر آج تک آپ لوگوں نے میری ہر بات' ہر خواہش' ہر ضد پوری کی ہے' جائز و ناجائز' چھوٹی بڑی جس چیز کی طرف اشارہ کیا آپ لوگوں نے بھائیوں نے وہ چیز میری جھولی میں ڈال دی لیکن میری زندگی کا سب سے بڑا اور اہم فیصلہ کرتے وقت آپ لوگوں نے مجھ سے پوچھنا تک گوارا نہیں کیا' میں نے کئی بار دبے لفظوں میں اور ماں جی سے کھلے الفاظ میں اس بات کا ذکر بھی کیا مگر...... میں یہ نہیں کہتا کہ خدانخواستہ تابندہ بری لڑکی ہے' وہ بہت اچھی نیک اور خوب صورت لڑکی ہے۔ محبت کرنے والی اور خیال رکھنے والی کیونکہ وہ بھابی کی بہن ہے مگر میرے دل میں' میرے خیال میں شریک سفر کا جو خاکہ ہے اس میں اور تابندہ میں بہت فرق ہے۔ مجھے بولڈ اور پڑھی لکھی لڑکی چاہیے جو ہر مقام پر میرے قدم سے قدم ملا کر چل سکے' میرا یہ اقدام آپ لوگوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوگا کیونکہ آپ لوگ کسی صورت میری بات نہیں مانتے اور میں ساری زندگی تابندہ کو وہ توجہ' وہ پیار اور وہ سب کچھ نہ دے پاتا جو اس کا حق ہوتا اور وہ ساری زندگی غیر مطمئن زندگی گزارتی محض ایک سمجھوتے کی طرح۔ وہ اتنی اچھی ہے کہ اسے رشتوں کی کمی نہیں ہوگی' بڑی بھابی! میں بہت برا ہوں آپ سے معافی مانگتا ہوں کہ آپ کا دل دکھایا ہے۔ بابا جان' ماں جی میرا قصور شاید آپ لوگوں کی نظر میں ناقابل معافی ہو مگر...... پلیز پلیز جس طرح بچپن میں آپ میری ہر خطا کو میرے ہر قصور کو معاف کر دیا کرتے تھے اسی طرح اپنے بچے کو معاف کر دیجیے گا۔ میں جا رہا ہوں مگر لوٹ آنے کے لیے' اس امید پر کہ آپ لوگ مجھے معاف کر دیں گے' آپ سب کا گناہ گار...... وصی!'' ''نابل...... ناہنجار...... تو نے...... تو نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔'' انعام شاہ جو دل تھامے خاموشی سے آنکھیں پھاڑے خط سن رہے تھے' خط کے اختتام پر ضبط کے تمام بندھن توڑ کر چیخے اور ساتھ ہی دونوں ہاتھوں سے دل پکڑے زمین کی طرف جھکنے لگے۔ ''بابا جان...... بابا جان......'' چاروں جانب سے سارے ان کی طرف دوڑے۔ ''ہمیں معاف کر دینا عرفانہ بیٹی! ہمیں اپنے خون سے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ وہ ہمیں اس عمر میں یوں بے عزت کرے گا۔ ناخلف نے ہمیں تم سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہ چھوڑا۔'' ''بابا جان...... بابا جان......'' عرفانہ نے تڑپ کر انعام شاہ کے جوڑے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا۔ ''مجھے گناہ گار نہ کریں' خدا کے لیے مجھے گناہ گار نہ کریں بابا جان!'' عرفانہ روتی ہوئی سسر کے ہاتھوں کو چوم کر بولیں اور انعام شاہ نے ایک بے بس سی نظر واجدہ بیگم پر ڈالی اور ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ واجدہ بیگم چیخ مار کر شوہر کے بے جان وجود پر گر پڑیں' عرفانہ اور تسکین پچھاڑیں کھانے لگیں۔ ذکی شاہ اور تقی شاہ عجیب سی بے یقینی کی کیفیت میں باپ کے بے جان وجود کو جھنجھوڑنے لگے۔ یہ سب کچھ اچانک سے ہی ہو گیا تھا' کیسے اور کیا ہو گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا شور سے بچے بھی جاگ گئے' باسل اور زہاد بھی کمرے سے باہر برآمدے میں آ گئے۔ چھ سالہ زہاد مٹھیاں بھینچے معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا بس وہ اتنا سمجھ پایا کہ یہ سب کچھ وصی چاچو کی وجہ سے ہوا ہے۔ دادا جان کی موت کے ذمہ دار وصی چاچو ہیں' امی جی اور چچی بلک رہی تھیں۔ پاپا اور تقی چاچو دہاڑے مار رہے تھے' دادو تڑپ رہی تھیں اس اچانک اور غیر یقینی افتاد نے جیسے سب کے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔ وصی کا یوں گھر سے چلے جانا اور سونے پہ سہاگہ دادا جی کی موت...... سب لوگوں کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔ وصی چاچو نے تابندہ خالہ سے شادی نہ کر کے دادا جی کو مارا ہے' یہ بات اس کے ننھے سے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی اور پھر تابندہ خالہ...... اس کی نظروں میں تابندہ کا چہرہ گھوم گیا۔ زہاد تو تابندہ کے ساتھ بہت زیادہ اٹیچ تھا سب سے زیادہ وصی سے بھی اور تابندہ سے بھی زہاد کی ہی بنتی تھی۔ تابندہ جب بھی آتی گھنٹوں زہاد کے ساتھ کھیلتی' اس کو نہلاتی' اس کے کپڑے استری کرتی' اس کے ساتھ درختوں پر چڑھ کر آم توڑ توڑ کر کھاتی۔ کتنا خوش رہتا تھا وہ تابندہ کے ساتھ کیونکہ جو باتیں امی نہیں مانتی تھیں وہ سب تابندہ سے منوا لیا کرتا۔ عرفانہ بیگم کبھی کبھی تابندہ پر غصہ بھی کرتیں کہ تم زہاد کی عادت بگاڑ کر چلی جاتی ہو وہ مجھے بعد میں تنگ کرتا ہے' تابندہ مسکراتی رہتی اور جب زہاد کو معلوم ہوا کہ تابندہ خالہ وصی چاچو کی دلہن بن کر ہمیشہ کے لیے اس گھر میں آ جائیں گی تو زہاد تو خوشی سے ناچنے لگا کہ پھر ہم تینوں مل کر خوب کھیلا کریں گے' خوب مزے کریں گے' ہے ناں امی۔ وہ عرفانہ بیگم سے تصدیق کرتا تو عرفانہ بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیتیں۔ مگر اس کے ننھے سے معصوم ذہن کو شدید جھٹکا لگا کہ وصی چاچو نے تابندہ خالہ کے ساتھ غلط کیا ہے' جب باسل اور زہاد تابندہ خالہ کو وصی کا نام لے کر تنگ کرتے تو تابندہ کے خوب صورت چہرے پر کتنے گلاب کھل جاتے' وہ ہولے ہولے مسکراتی رہتیں۔ وصی کے کمرے میں جا کر ان کے کمرے کی صفائی کر دیتیں' ان کے لیے چائے بنا کر خود ان کے کمرے میں جا کے دے آتیں' نیچے سر جھکائے چہرے پر شرم و حیا کا عکس لیے وہ کتنی پیاری لگتیں۔ زہاد کو تابندہ پر بھی بہت ترس آ رہا تھا۔ ''وصی چاچو آپ نے یہ غلط کیا ہے' بہت غلط...... آپ نے میرے دادا جی کو مارا ہے' میری امی جی کو دکھ دیا ہے۔ دادو کو اور...... اور میری تابندہ خالہ کو ٹھیس پہنچائی ہے۔'' وہ دل ہی دل میں کھول رہا تھا' وصی چاچو اسے جان سے زیادہ عزیز تھے مگر نہ جانے کیوں ایک لمحے میں وہ اسے دنیا کے سب سے برے آدمی لگے۔ ظالم اور گندے آدمی جنہوں نے کتنے لوگوں کو دکھ دیا تھا۔ کتنی آنکھوں کو جل تھل کیا تھا' ہنستا بستا گلشن کس طرح سسکیوں اور اداسی میں ڈوب گیا تھا۔ انعام شاہ کا جس وقت ان کا جسد خاکی اٹھایا جا رہا تھا ہر طرف آہ و بکا اور سسکیاں گونج رہی تھیں' گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ کہ لوگوں نے دیکھا وصی شاہ گھر میں داخل ہوئے' ملگجے کپڑے' بکھرے بال' آنسوؤں سے تر چہرہ اور زرد رنگت لیے وہ دروازے سے آگے بڑھے تھے سامنے ہی ماں جی نظر آ گئیں۔ ہمیشہ ہلکے رنگوں کے کپڑے پہننے والی ماں جی آج سفید کپڑوں میں سر پر سفید بیوگی کی چادر اوڑھے صدمے اور دکھ سے نڈھال...... وصی تڑپ گئے۔ وہ آگے بڑھے کہ اچانک ماں کی نظر اٹھی عین سامنے وصی کھڑے تھے ٹوٹے بکھرے اور نڈھال سے وصی جن کی آنکھوں میں ندامت اور بے چارگی کے دکھ آنسوؤں کی شکل میں نمایاں تھے۔ ماں جی کے چہرے کا رنگ یکلخت بدل گیا' دکھ اور ملال کی جگہ سختی اور کرختگی نے لے لی۔ ''تقی......'' انہوں نے اتنی زور سے آواز دی کہ وہاں پر موجود ہر شخص کی نظر ان کی جانب اٹھ گئی۔ ''ذکی......'' انہوں نے بڑے بیٹے کو بھی آواز دی۔ ''جی ماں جی۔'' دونوں ایک ساتھ بولے۔ ''اس ناخلف کو بولو کہ اپنا ناپاک وجود لے کر یہاں سے فوراً نکل جائے۔'' ماں جی نے وصی شاہ کی طرف اشارہ کر کے نفرت سے کہا۔ ''ماں جی...... وہ بابا جی کا آخری دیدار کرنے آیا ہے۔'' ذکی شاہ نے کہا۔ ''نہیں اسے کوئی حق نہیں ہے۔'' ماں جی کی آواز میں سختی اور قطعیت تھی۔ ''پلیز ماں جی...... ایک نظر دیکھ کر چلا جائے گا۔'' عرفانہ بیگم نے وصی کے دھواں دھواں ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ماں جی کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''خاموش ہو جاؤ تم سب۔'' ماں جی دھاڑیں۔ ''اگر کوئی اس معاملے میں بولا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اس سے کہو اپنا منحوس چہرہ ہمیشہ کے لیے گم کر لے' میں اس کا وجود ایک لمحے کے لیے بھی اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔'' ''ماں خدا کے لیے......'' وصی شاہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھے لیکن ماں جی پتھر کی ہو گئی' سخت دل اور اٹل۔ ''اس بدبخت سے کہو اس کے باپ کے ساتھ اس کی ماں بھی مر گئی۔ اسی وقت جس وقت اس نے بنا سوچے سمجھے اس گھر سے اپنے قدم نکالے اور ہاں اگر یہ یہاں ایک منٹ بھی رکا تو تم لوگوں کو یہاں سے دو جنازے اٹھانے پڑیں گے۔'' لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔ ''نہیں نہیں ماں جی خدا نہ کرے۔'' سب لوگ ایک ساتھ بولے۔ ''آپ کو اللہ تعالیٰ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔'' ماں جی کا جملہ وصی شاہ کے لیے ایک لمحے رکنے کا بھی جواز نہیں رکھتا تھا' انہوں نے ایک نظر اپنی ماں پر ڈالی' بے بسی اور بے چارگی سے بے تحاشہ بہتے آنسوؤں سے باپ کے کفن میں لپٹے بے جان وجود کو دیکھا اور سر جھکا کر سسکتے ہوئے گھر سے نکل گئے۔ ''آج کے بعد اس گھر کے اور میرے دل کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس بدبخت پر بند ہو گئے ہیں' آج کے بعد نہ کوئی اس کا ذکر کرے گا نہ ہی اس کے لیے کوئی ہمدردی کرے گا۔ تم سب لوگ کان کھول کر سن لو۔'' انعام شاہ کا سوئم بھی ہو گیا' گھر کا ماحول بے حد مکدر ہو چکا تھا' ماں جی ہر وقت اپنے کمرے میں بیٹھی قرآن پاک پڑھتی رہتیں۔ ذکی شاہ اور تقی شاہ بالکل ٹوٹ چکے تھے انہیں آج بھی بزنس کے ہر معاملے میں بابا جی کی سپورٹ اور مشوروں کی ضرورت تھی۔ وہ آخری دم تک بزنس میں برابر اپنے بچوں کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ عرفانہ بیگم اور تسکین بالکل چپ ہو کر رہ گئی تھیں ویسے بھی آج کل تسکین کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ وصی کا کمرہ لاک کر دیا تھا ان کے استعمال کی بیشتر چیزیں اسٹور روم کی الماریوں میں بند ہو چکی تھیں ان سے وابستہ ہر چیز کو نظروں سے اوجھل کر دیا گیا تھا وصی جیسے ایک یاد بن کر رہ گئے تھے۔ انعام شاہ کی تدفین کے موقع پر عرفانہ بیگم کی والدہ آئی تھیں چہلم کے بعد سب واپس لوٹ گئے مگر تابندہ یہیں رک گئیں ایک تو یہاں کے حالات ایسے تھے اور دوسرے تسکین کی طبیعت کی وجہ سے کہ کسی وقت بھی وہ ہسپتال جا سکتی تھیں تو گھر میں عرفانہ کے ساتھ وہ ہاتھ بٹا سکتی تھیں۔ زہاد زیادہ تر تابندہ کے ساتھ چپکا رہتا' اس نے دیکھا تھا کہ تابندہ خالہ جو ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہتی تھیں' شرارتیں کرتی تھیں وہ بالکل چپ ہو کر رہ گئی تھیں۔ راتوں کو اکثر زہاد اٹھتا تو تابندہ جاگتی ہوئی ملتیں' چپکے چپکے روتی رہتی تھیں۔ زہاد کا بس نہیں چلتا کہ اپنی خالہ کو کس طرح ہنسائے' وہ اپنے طور پر معصوم حرکتیں کرتا' اسے بہلاتا۔ تابندہ سر جھکائے خاموشی سے کام میں لگی رہتی' تسکین کی طبیعت خراب ہوئی تو عرفانہ بھی ان کے ساتھ ہسپتال چلی گئیں۔

(باقی جولائی کے شمارے میں)

فیس بک انچارج
عمران رضا بٹ، فاطمہ خان
نوشین اقبال نوشی

گلدستہ ماہ رمضان و عید نمبر

امتیاز عاصم: 0302-7898699
وسیم طاہر ڈھکو: 0345-7462919

افسانہ (نور جہاں)

ایم بے قریشی۔ ڈی۔ آئی۔ خان

آج پھر نور جہاں کی آواز سے سونیا کی آنکھ کھل گئی اٹھتے ہی اُس غریب کو کوسنا شروع کر دیا۔ ارے کوئی ٹائم پیس بھی ہوتا تو یوں پورے ٹائم پر نہ بجتا۔ یہ بدبخت پورے 7:00 بجے اپنی گدھا گاڑی کے ساتھ نازل ہو جاتا ہے۔ سونیا بستر سے باتھ روم جانے تک بیچارے نور جہاں کیلئے کیا کیا بڑبڑائی! اور حسب معمول اماں کی صبح کی کراری کراری گالیاں جو بیان نہیں کی جا سکتی ان کو سنی ان سنی کر کے ناشتے کیلئے باہر آئی تو ابھی بھی بے چارے نور جہاں کو کوس رہی تھی۔ پاس بیٹھی دادی نے کہا! کیا اللہ واسطے کا بیر ہے تجھے نور جہاں سے تو اچھا گاتا ہے بے چارا، جب سے گاؤں کا پانی خراب ہوا ہے۔ کتنی دور سے گاؤں والوں کے لیے پانی بھر کر لاتا ہے۔ کوئی احسان نہیں کرتا دادی۔ پیسوں سے پانی دیتا ہے کوجھا کہیں کا۔ ارے کسی کی بدصورتی کیلئے کوئی کسی سے اتنی نفرت کرتا ہے۔ یہ سونیا کی اور دادی کی روز کی ڈسکشن ہوتی۔ اماں کے برتن اکٹھے کرنے تک سونیا کالج کیلئے تیار ہو چکی تھی۔ اتنے میں دروازے پر مینی چلائی سونیا! جلدی کر کیا آج بھی کالج سے دیر کروائے گی۔ دروازے سے نکلتے وقت سونیا نے اماں کی اتنی بات سنی آج پھر سہیلیوں کے ساتھ پیدل نہ آنا رحیمے کے تانگے پر آ جانا۔ آج گھر میں کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ تیری دادی کے دور کے رشتہ دار ہیں، چاچا ہی سمجھ لے تیرے ابو کے کزن ہیں اور اس کے اور اماں کیا بول رہی تھی کچھ سمجھ نہیں آیا سونیا کو۔ مینی جانتی تھی کہ اُس کو کس بات کی جلدی ہے آج پھر اس کو ریان سے ملنے جانا تھا۔ ابھی کالج ٹائم ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ریان اسکو لینے آ گیا۔ مینی کالج اور سونیا ریان کے ساتھ چلی گئی۔ جاتے وقت مینی سے بولی امیں رحیمے کے ساتھ سیدھا گھر چلی جاؤں گی تو اپنے گھر چلی جانا۔ حسب معمول ریان خاموشی سے سونیا کو دیکھتا جا رہا تھا اور وہ مسلسل بول رہی تھی۔ قریب ہی کسی پگڈنڈی سے بوتلیں اٹھائے نور جہاں گانا گاتا ہوا جا رہا تھا۔ جی سونے دیا کنگناں سودا پکڑن جیا۔ دل دینا تے دل لگنا سودا ہوون جیا۔ ریان توجہ سے مسکراتے ہوئے نور جہاں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک سونیا بولی۔ ارے یہ بدبخت جہاں جاتی ہوں وہیں پر پہنچ جاتا ہے۔ جتنی چڑ ہے مجھے اس سے اُتنا ہی سامنے آ جاتا ہے۔ ریان نور جہاں کا گانا سننے میں اتنا کھو گیا تھا کہ اُس نے سونیا کی بات کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ وہ دیکھ سونیا تانگے والا رحیما آ رہا ہے اور آج تمہیں گھر جلدی جانا ہے اُس نے اگر مجھے دیکھ لیا تو ایسے ہی سیاپا پڑ جائے گا۔ تو گھر جا سونیا! یہ کہہ کر ریان دور بیری کے درختوں میں چھپ گیا۔ سونیا رحیمے سے بولی آج گھر جلدی جانا ہے چلتے چلتے تھک چکی ہوں۔ اس لیے مجھے ذرا گھر چھوڑ دے لیکن دونگی صرف دس روپے۔ ہاں سونیا کندھے اُچکا کر بولی گھر پہنچی تو مہمان پہلے سے ہی موجود تھے اور دادی ان کو چائے دے رہی تھی۔ اماں کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ اس نے سونیا کو کھڑکی سے دیکھا سونیا اماں کو دیکھے بغیر مہمان سے ملنے لگی۔ تو تھوڑی دیر بعد گلی میں نور جہاں کی آواز سنی تو عرفان چچا نے دادی سے پوچھا۔ ارے یہ اتنا خوبصورت کون گا رہا ہے دادی تو پہلے ہی نور جہاں کی بہت بڑی فین تھی شروع ہو گئی اور جہاں کی کہانی سنانے یہ تو نور جہاں ہے اپنے گاؤں کا بہت غریب آدمی ہے۔ پانی بیچتا ہے اس کی کہانی کسی فلم سے کم نہیں ہے۔ عرفان چچا بھی بڑی توجہ سے نور جہاں کی کہانی سننے کو تیار بیٹھے تھے۔ اور سونیا سب میں بیٹھ کر اخلاقاً نور جہاں کی کہانی سننے پر مجبور تھی۔ انتہائی بدصورت ہے بے چارا لیکن اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ غریبی کی وجہ سے اُس نے نور جہاں سے شادی کر لی۔ دونوں کا ایک خوبصورت بیٹا ہے بالکل اپنی ماں پر گیا ہے اس کو جنم دیتے وقت ماں چل بسی اُس دن سے نور جہاں اپنے بیٹے کو ماں اور باپ بن کر پال رہا ہے۔ دن رات محنت کر کے اس کو تعلیم دلا رہا ہے کسی شہزادے سے کم نہیں رکھا اسکو دادی کی کہانی ختم نہ ہوئی کہ اچانک گلی میں شور ہوا کہ دیکھو نور جہاں کو کیا ہو گیا۔ سارا گاؤں گلی میں اکٹھا ہو گیا۔ کسی نے جلدی سے ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کی اور وجہ ہارٹ اٹیک بتائی۔ سارا گاؤں افسردہ تھا۔ مگر سونیا خوش اب مجھے صبح سات بجے کوئی نہیں اٹھائے گا۔ نور جہاں کی باتیں کرتے کرتے سب سو گئے اور سونیا بھی اپنے کمرے میں سونے چلی گئی۔ صبح سات بجے وہی آواز سونیا کے کانوں میں سنائی دی جی سونے دیا کنگناں سودا ہوون جیا۔ دل دینا تے دل لگنا سودا ہوون جیا۔ ارے نور جہاں کا بھوت ہے کیا سونیا ہڑبڑا کر اٹھی اور سامنے جو نظارہ دیکھا اس سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بے ساختہ اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔ ریان

نبیلہ نازش راؤ اوکاڑہ

برائی کوئی بھی ہو خواہ وہ معاشرتی یا غیر معاشرتی برائی تو برائی ہوتی ہے بہت ساری ایسی معاشرتی اور سماجی برائیاں جو ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ لیتی ہیں یہ برائیاں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ ان کی روک تھام کرنا تو در کنار انہیں ختم کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہو گیا ہے۔ اگر ہم سب چاہیں تو برائی سے جنم لینے والی معاشرتی سماجی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں مگر ایسا کرنے میں اس عمل میں کون آئے گا۔ کیونکہ جو لوگ ان برائیوں کو جنم دیتے وہی ان کی ہر قدم پر پیروی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان پر کنٹرول پانا انتہائی مشکل عمل ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے برائیوں کے دروازے کھلتے چلے گئے اور خطرناک راستے اختیار کرتے چلے گئے انہیں برائیوں میں سے ایک بہت بڑی معاشرتی برائی ڈاکٹرز ہیں۔ جو اس پاکیزہ اور مقدس شعبے سے وابستہ ہیں وہ انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دے رہے ہیں اور بے حسی سے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ احساس خدمت خلق ادارہ ہے جس سے منسوب ڈاکٹرز انسانیت کی خدمت کو اپنا نصب العین بنانے کی بجائے قصاب بن چکے ہیں۔ یہ وہ قصاب جو سرکاری یا غیر سرکاری ڈاکٹرز ہیں۔ اپنے پیشے سے منسلک ہو کر انصاف اور نہ ہی فرائض کو ایمانداری سے نبھا رہے ہیں یہ پیشہ ور ڈاکٹرز انسانیت کی خدمت کرنے کی بجائے انسانیت کا قتل عام کر رہے ہیں۔ یہ وہ قصاب ہیں جو غریب عوام کے گلوں پر جانوروں کی طرح چھری پھیرتے بے دردی سے ذبح کرتے ہوئے اپنی آمدنیاں اور کلینکوں کو چمکا رہے ہیں۔ غریب لوگوں کی آمدنی اتنی ہوتی ہے کہ ایک وقت کی دال روٹی پیٹ بھرائی نہیں ملتی ان کے بمشکل چولہے چلتے ہیں۔ مہنگے ترین علاج کیسے کروا سکتے ہیں۔ پرائیویٹ علاج کروانا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ پرائیویٹ ڈاکٹرز بھی جب تک کیس نہیں پکڑتے تب تک ان کی بھاری بھر رقم ان کی ہتھیلی پر نہ دھر دی جائے ان کو اپنی فیس سے غرض ہوتی ہے مریض سے نہیں وہ چاہے مرے یا جیئے جو غریب لوگ فیس ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ سرکاری ہسپتالوں کی جانب دوڑ لگاتے نظر آتے ہیں۔ جہاں اعلیٰ عہدیداران سے ڈاکٹرز اور میسر سے لے کر دروازے پر کھڑے پی اے تک کا رویہ اور لہجہ اس قدر تضحیک آمیز ہوتا ہے کہ وہاں جانے والے مریض مایوسی اور بدظنی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن غریب لوگوں کی مجبوریاں انہیں پھر ادھر جانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اوپر سے لے کر نیچے تک کا عملہ حکومت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے حکومت سے سرکاری ڈاکٹرز کس حق کی بنا پر ہر ماہ بھاری تنخواہیں ادا کر رہی ہے سرکاری ہسپتالوں میں عوام کو کسی قسم کی سہولت میسر نہیں۔ بیٹھنے کو وہاں بینچ نہ کرسیاں ہیں یہ سب اسٹور اور رومز میں پڑی دیمک کی خوراک بن رہی ہیں۔ حکومت کروڑوں روپے کی ادویات سرکاری ہسپتالوں میں فراہم کرتی ہے لیکن وہ دوائیاں کسی مریض کو بھی ملتی نہ دی جاتی ہیں کہاں جاتی ہیں یہ حکومت کو باخبر رہنا چاہیے یہ نہیں کہ ہسپتالوں کو پہنچا کر خود اپنی آنکھیں بند کر لے اور بے خبر رہے۔ اول تو سرکاری ڈاکٹرز ہسپتالوں میں ملتے ہی نہیں اگر آ جائیں تو اپنے کمروں سے باہر ہی نہیں نکلتے یا پھر ڈاکٹرز آفس میں گپ شپ کرتے رہتے ہیں۔ کچھ ڈاکٹر تھوڑا بہت وقت مریضوں کو دے کر اپنے پرائیویٹ کلینکوں پر رخ کرتے ہیں جہاں مریض ان کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ سرکاری ڈاکٹرز اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ سرکاری ہسپتالوں میں اکثر ایسے واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ڈاکٹرز کی عدم موجودگی میں فوری طبی امداد نہ ملنے پر اموات ہوتی رہتی ہیں۔ جنہیں اکثر و پیشتر ٹی وی چینلز پر لایا کرتے ہیں۔ اور اخبارات میں رپورٹس شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کیا یہ سب حکومت کی نظر سے نہیں گزرتی سوچنے کی بات ہے؟ سب کچھ حکومت پڑھتی اور سنتی ہے اس کے باوجود حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور نہ ہی ڈاکٹرز سبق آموز واقعات سے سبق سیکھتے ہیں غریب عوام کی جانوں سے کھیل رہے ہیں ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ غریب عوام زیادہ سے زیادہ احتجاج کر لیتی ہے جو بے سود ثابت ہوتا ہے۔ یا پھر رو پیٹ کر صبر کرتی اور اپنے پیارے کی میت لے جا کر تدفین کی تیاری کرتی ہے۔ ڈاکٹرز کا غریب عوام کے ساتھ نازیبا اور سنگدلانہ رویے کا پردہ فاش کرتے ہوئے اکثر واقعات دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن ان پر آج تک عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اپنی آنکھوں سے دل دوز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا واقعہ دیکھا ہوا یوں کہ میں ہسپتال کے باہر گیٹ تک پہنچی ہی تھی کہ ہسپتال سے باہر رونے کی آوازیں دل کو ہلا رہی تھیں میرے لیے گیٹ عبور کرنا مشکل ہو گیا۔ جدھر سے چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں اُسی سمت مجھے مڑنے پر مجبور کر دیا۔ بے اختیاری اور لمبے لمبے قدم بھرتی جب میں ان روتی پیٹتی خواتین تک پہنچی تو دل ڈوب سا گیا۔ کافی دیر تک کچھ سمجھ میں نہ آیا کس سے پوچھوں کہ کیا ہوا ہے؟ ذرا سا آگے بڑھی تو چند خواتین اپنے تھپڑ اپنے ہی منہ پر رسید کر رہی تھیں اور ان کے چہرے ہوش و حواس سے بیگانہ کچھ خبر نہیں کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔ ایک بہت بڑا ہجوم کو ہٹاتی ان خواتین تک رسائی حاصل کی بہت کوشش کے بعد ایک خاتون کو بولنے اور کچھ بتانے پر مجبور کر سکی۔ وہ اتنا ہی بتا سکی کہ اس کا نوجوان بھائی کو اچانک نہ جانے کیا ہوا گھر حالت خراب ہوئی تو ہم لوگ سرکاری ہسپتال لے آئے۔ جب ہم لوگ یہاں پہنچے تو کوئی ڈاکٹرز ڈیوٹی پر موجود نہیں ابھی تک کسی ڈاکٹرز کو ہم نے نہیں دیکھا آ کر ہمارے مریض کو چیک کر کے بتائے اسے کیا ہوا ہے۔ کوئی وارث نہیں بنا نہ کوئی مسیحا جو میرے بھائی کو بچا سکے۔ ان کے ساتھ آنے والے گرم زمین کے فرش پر لیٹے روتے ہوئے ایک ہی لفظ دہرا رہے تھے کہ ہمارے بھائی کا یہاں کوئی علاج کرنے والا نہیں کوئی ڈاکٹر ابھی تک نہیں آیا ایمرجنسی مریض کو دیکھنے میں ایمرجنسی وارڈ میں گئی رش کی انتہا پاؤں دھرنے کی جگہ نہیں بمشکل جگہ بنا کر وارڈ تک رسائی ہوسکی۔ وہاں جا کر دیکھا تو مریض ہوش سے بے خبر ایک بینچ پر لٹایا ہوا تھا۔ ڈاکٹرز کی عدم موجودگی جو عملہ وہاں موجود تھا وہی اس مریض پر جھکا اور سینے کو دبا دبا کر دیکھ رہا تھا سانس چل رہی ہیں کہ نہیں موت اور زندگی کی کشمکش میں مریض بے رحم ڈاکٹروں کے رحم و کرم کا منتظر تھا۔ لوگ یہ چہ مگوئیاں کر رہے تھے کہ مریض اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکا ہے ادھر عملہ بھی مایوس دکھائی دے رہا تھا پھر بھی اپنی کوششوں میں لگا مریض کے سینے پر مسلسل دباؤ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اگرچہ مریض کسی قسم کی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ وہاں ہجوم کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹرز کی بے حسی بے رخی لاپرواہی کی نظر ایک اور قیمتی انسانی جان اور کسی کے گھر کے کفیل کا چراغ گل ہو گیا۔ کیا انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کے خواب کو تعبیر تو ملی مگر حقیقت میں اس خواب کو وسعت نہ ملی اور ان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ دیکھا جائے تو ان کے خواب کو حقیقی معانیوں میں تعبیر نہیں مل سکی جس کا انہوں نے تصور کیا تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح جنہوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف انتھک محنت اور جہد و جہد کی اور ایک طویل جنگ لڑنے کے بعد آزاد مملکت اسلامی جمہوریہ پاکستان بنایا اور کہا کہ نئی نسل اس ملک کی معمار اور ایک اہم ستون ہو گی۔ مگر اس قوم کے معمار صرف اور صرف پیسہ کمانے کے چکروں میں ملک اور عوام کو نقصان پہنچانے میں عمل پیرا ہیں ملکی بنیادوں کو کھوکھلا اور کمزور بنانے دہشت گردوں کو مضبوط بنانے میں سرگرداں ہیں۔ افسوس قائد اعظم محمد علی جناح نے اسلامی جمہوریہ پاکستان اس لیے بنایا قوم آزاد اور خود مختار ہو۔ اس آزاد مملکت کو اصولوں اور قانون سازی کے مطابق چلانے والا حکمران آج تک نہ مل سکا۔ جو اس ملک کو ترقی کی جانب گامزن اور ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کر سکے۔

ظالم زمانہ

اسلام علیکم ندیم عباس ڈھکو

شاہد رفیق سہو کبیر والا

جہاں گھر میں چار افراد کمانے والے ہوں وہاں بھی آج زمانہ گزر مشکل ہے ہمارا گھرانا تو واحد کفیل سے بھی محروم تھا سو گریجویشن کرتے ہی ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی چھ ماہ کی تلاش بسیار کے باوجود کامیابی نہ ملی دفتر دفتر گھومتے پاؤں زخمی ہو گئے کہیں نوکری ملتی بھی تو دور دراز اور تنخواہ اتنی کم ہوتی کہ کرایہ پلے سے بھرنا محال ہو جاتا تھک ہار کر گھر بیٹھ گئی اب بیوہ ماں اور چھوٹے بھائی بہنوں کی ضروریات زندگی کے اندیشے سانپوں کی طرح نظروں کے سامنے لہرانے لگے میں سب سے بڑی تھی باقی تینوں چھوٹے تھے اماں وضع دار خاتون تھیں اپنی تکالیف کا کسی سے ذکر نہ کرتی تھیں لیکن پھر وہ دن بھی آ گیا جب ان کو پڑوسن کے سامنے اپنی داستان بیان کرنی پڑی ہماری پڑوسن خالہ شہناز ایک ہمدرد خاتون تھیں اماں سے ان کے اچھے تعلقات تھے ان کا بیٹا جہاں زیب ایک اچھی کمپنی میں ملازمت کرتا تھا خالہ نے بیٹے سے کہا کہ تمہاری کمپنی میں کوئی جگہ ہو تو صوبیہ کو رکھوا دو یہ بے چاری نوکری کے لیے کب سے بھٹک رہی ہے جہاں زیب نے کہا اگر صوبیہ کمپیوٹر سیکھ لے تو میں اپنے باس سے بات کروں گا کیونکہ صرف ڈگری کے ساتھ نئی زمانہ کمپیوٹر کا استعمال دفاتر میں لازمی ہو گیا ہے مجھے کمپیوٹر کی معلومات نہ تھی صرف بی اے کیا تھا جہاں زیب نے بہر حال مدد کی میں پڑوس میں جا کر اس سے سیکھتی وہ شام کو ایک ایسے ادارے میں بھی لے جاتا جہاں کمپیوٹر کا استعمال سکھایا جاتا تھا تین ماہ بعد مجھے ابتدائی نوعیت کا ڈپلومہ مل گیا اور میں اچھی طرح جان گئی کہ ترقی کی اس مشین کو کیسے چلاتے ہیں۔ تب اس نے اپنے باس سے میرے لیے بات کی خوش قسمتی سے ان ہی دنوں ایک لڑکی ملازمت چھوڑ کر چلی گئی تھی اس کی جگہ مجھے رکھ لیا گیا کمپنی کا باس اچھا آدمی تھا اس نے پہلے روز مجھ سے چند سوالات کئے اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی نگاہوں میں میرے لیے پسندیدگی کے جذبات تاہم وہ ایک محتاط آدمی تھا ایسے لوگ شریف لڑکیوں کا ہرگز پیچھا نہیں کرتے لیکن خود لفٹ دینے والی لڑکیوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں مجھے باس سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا کیونکہ میں ایک سنجیدہ مزاج لڑکی تھی اور اپنے کام سے کام رکھتی تھی صاحب جان گئے کہ میں کس قسم کی لڑکی ہوں اور میرے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے جلد ہی میں باس کے شریفانہ رویے سے مطمئن ہو گئی خوش قسمتی کہ کام بہت زیادہ نہ تھا لیکن تنخواہ معقول مل رہی تھی پک اینڈ ڈراپ کی سہولت موجود تھی کیونکہ آفس ایک تھا لہذا جہاں زیب اور میں ایک ہی گاڑی میں آتے جاتے تھے۔ جہاں زیب مجھے بچپن سے جانتا تھا میں بھی اس پر اعتبار کرنے لگی وہ بہت با اخلاق تھا میرا خیال رکھتا تھا دفتر میں کوئی دشواری ہوتی کام سمجھنے میں مشکل پیش آتی تو وہ فوراً میری مدد کرتا وقت گزرتا رہا چار سال گزر گئے اس دوران میری تنخواہ کے ساتھ عہدے میں بھی ترقی ہو گئی لیکن جہاں زیب مطمئن نہ تھا وہ زیادہ کمانا چاہتا تھا جلد از جلد امیر ہونا چاہتا تھا اگرچہ ان کے معاشی حالات دگرگوں تھے تینوں چھوٹے بہن بھائی پڑھ رہے تھے انکے تعلیمی اخراجات اور گھر کا خرچ میری تنخواہ سے چل رہے تھے اب میں 25 برس کی ہو چکی تھی والدہ کو میری شادی کی فکر کھائے جاتی تھی وہ چاہتی تھی کہ چھوٹا بھائی تعلیم مکمل کر لے تو میرے ہاتھ پیلے کر دیں شادی کی ایک عمر ہوتی ہے خاص طور پر لڑکی کی شادی کی اگر وقت پر نہ ہو سکے تو بعد میں مناسب رشتوں کا ملنا مشکل امر ہو جاتا ہے ایک روز خالہ شہناز آئیں امی نے ان سے اپنی اس پریشانی کا تذکرہ کیا وہ بولیں تم ٹھیک کہتی ہو بہن میں بھی جہاں زیب کے بارے میں آج کل کچھ ایسا ہی سوچ رہی ہوں کہ وقت پر اس کا گھر بس جائے لڑکوں کی بھی اگر شادی مناسب وقت پر نہ ہو تو وہ پریشان رہنے لگتے ہیں دونوں ماؤں کا مسئلہ ایک ہی تھا لہذا دونوں اس پر سوچنا شروع کر دیا کچھ روز کے بعد خالہ دوبارہ آئیں اور امی سے کہا تمہاری بیٹی کا بچپن میں میری نظروں کے سامنے گزرا ہے صوبیہ میں وہ سارے گن ہیں جو ایک اچھی لڑکی میں ہونے چاہئیں سوچتی ہوں کیوں نہ اپنے جہاں زیب کے لیے صوبیہ کا ہاتھ مانگ لوں بہو اچھی ہو تو گھر کا سولہ سنگھار ہوتی ہے جو بدقسمتی سے بری مل جائے تو گھر کے بجائے کرذاتیل ہو جاتی ہیں اماں نے خالہ شہناز کی بات دل کے کانوں سے سنی اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اماں خوش ہو گئیں بیٹھے بٹھائے بیٹے کے لئے ہاتھ مانگ کر خالہ شہناز نے میری ماں کا کتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا طے ہوا کہ بھائی صفدر کی تعلیم مکمل ہوتے ہی میری شادی جہاں زیب سے کر دیں گی اور میری جگہ گھر کی ذمہ داریاں بھائی صفدر اٹھائے گا جہاں زیب کے لیے میرے دل میں کبھی کوئی ایسا خیال نہ آیا تھا گھر کے مسائل میں ہی الجھی رہتی تھی جب اماں نے آگاہ کیا تو پہلی بار جہاں زیب کے لیے سوچا مجھے اس میں خوبیاں ہی خوبیاں دکھائی دیں کوئی خامی نظر نہ آئی وہ مجھے دل سے اچھا لگا چار سال ہم اکٹھے ایک بس میں آتے جاتے رہے تھے اس دوران کوئی غلط بات منہ سے نہیں نکالی تھی جہاں زیب نے آفس میں میرا اسی طرح خیال رکھا تھا جیسے اپنے اپنوں کا رکھتے ہیں میرے دل میں اس کے لیے احترام تھا مگر کوئی شکایت نہ تھی برے دنوں میں سوچا کرتی تھی کہ کبھی شادی نہ کروں گی اپنی زندگی والدہ کی خدمت اور بھائی بہنوں کے لیے واقف کر دوں گی لیکن جب ماں نے جہاں زیب کا نام لیا تو دل نے کہا پاگل اتنا اچھا رشتہ پھر نہ ملے گا یہ دیکھے بھالے لوگ ہیں۔ پرانے پڑوسی ہیں برسوں کا ساتھ ہے انکار کی تو بوڑھی ماں کا دامن سے عمر بھر جھاڑ کے کانٹے کی مانند الجھی رہ جاؤ گی صفدر ماشاءاللہ جوان سال تھا تعلیم مکمل کر لی تھی ملازمت بھی آخر مل ہی جانی تھی اب گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی اس کی باری تھی میں نے ہاں کہہ دی میری جہاں زیب سے منگنی ہو گئی لیکن اس امر کو ہم نے دفتر والوں سے چھپائے رکھا کہ لوگوں کی نگاہیں ہم پر مرکوز نہ ہو جائیں خواہ مخواہ کی الجھن رہے گی منگنی کے بعد میرے دل میں جہاں زیب کے لیے خاصی جگہ بن گئی وہ خوبصورت تھا میرا بہت زیادہ خیال رکھنے والا دل ہی دل میں اسے چاہنے لگی لیکن اظہار نہ کر پائی تھی اچانک جہاں زیب کو بیرون ملک جانے کا شوق چرایا وہ اس نوکری سے مطمئن نہ تھا جلد امیر ہونا چاہتا تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ عرصے سے اسی جستجو میں لگا ہوا ہے اپنی خوش قسمتی یا شومئی قسمت کہ ان دنوں ایک دوست کی توسط سے اس کو سعودیہ میں ملازمت کا موقع مل گیا کافی تنخواہ تھی لیکن جس ایجنٹ نے ویزے کا بندوبست کرنا تھا وہ ایک لاکھ روپیہ مانگ رہا تھا جہاں زیب کے والد بوڑھے اور پنشن یافتہ تھے اس کے بڑے بھائی کی تنخواہ ہرگز ربسر ہو رہی تھی جو خود شادی شدہ تھا ان کے دو بچے بھی تھے جبکہ گھر میں دو بہن بیاہی بیٹھی تھی جن کو بیاہنے کے فرائض ابھی باقی تھے جہاں زیب کے والدین نہ چاہتے تھے کہ وہ موجودہ روزگار کو خیرباد کہہ دے دوبارہ ایسی نوکری ملے کہ نہیں یہ ایک اہم سوال تھا اور اندیشہ بھی مگر جہاں زیب کے سر پر دیار غیر جانے کا بھوت سوار ہو چکا تھا اس نے اپنی ماں اور بڑے بھائی سے ایک لاکھ روپیہ مانگا جو ایجنٹ کو ادا کرنا چاہتا تھا انہوں نے یہ رقم دینے سے معذرت کر لی جہاں زیب گھر والوں سے مایوس ہو گیا اور اس نے مجھ سے تذکرہ کیا کہ قدرت زندگی میں ایک آدھا بار ہی کسی کو ایسا موقع دیتی ہے جب وہ اپنی زندگی میں بہتر بنا

"دنیا کسی کی نہیں"

سکتا ہے اور میرے گھر والے اس بات کو نہیں سمجھ رہے کاش میرے پاس ایک لاکھ روپیہ ہوتا تو میں کسی کی منت ساجت کے بغیر چلا جاتا یہ بات اس نے کچھ اس طرح دکھ سے کہی کی میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں ان ہی دنوں باس نے مجھے اپنی سیکرٹری کے فرائض سونپنے کی خواہش کا اظہار کیا ان کی ادھ عمر سیکرٹری بیمار ہو گئی تھی اور اس نے بیماری کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا باس نے مجھے بلا کر کہا صوبیہ تم چار برس سے یہاں کام کر رہی ہو تم نے کبھی لاپرواہی نہیں برتی میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں ثمینہ کے استعفیٰ کے بعد چاہتا ہوں تم ان کی جگہ لے لو تنخواہ بھی بڑھ جائے گی اور مراعات بھی ملیں گی چار برس کے عرصے میں اپنے باس کی شرافت کی قائل ہو چکی تھی فوراً اس پیشکش کو قبول کر لیا کیونکہ شادی کے لیے جہیز کے علاوہ رقم بھی درکار ہوتی ہے میں نے سوچا کہ جلد اللہ تعالیٰ نے ہماری اس ضرورت کا انتظام کر دیا ہے ادھر جہاں زیب زیادہ کمائی کی خاطر شادی کو ایک دو سال کے لیے موخر کرنا چاہتا تھا ہر حالت میں بیرون ملک جانا چاہتا تھا اور اب وہ بار بار کف افسوس ملتا تھا کہ صرف ایک لاکھ کا مسئلہ تھا اے کاش کہ میں کچھ پس انداز کرتا اور اپنی ساری تنخواہ والدہ کے ہاتھ پر دھرنے کی بجائے اپنے لیے بھی جوڑ کر رکھتا تو آج ایک لاکھ کی خاطر مجھے یوں اپنی آرزوؤں کا گلہ نہ دبانا پڑتا جہاں زیب کے بار بار یہ الفاظ دہرانے سے میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی کیونکہ میں اس سے محبت کرنے لگی تھی اپنے منگیتر کو اتنا دکھی دیکھ کر فیصلہ کیا کہ کیوں نہ باس سے تذکرہ کروں وہ اتنے مہربان ہیں اپنی کمپنی کے پرانے ملازمین کی قدر کرتے ہیں اور کبھی کبھار ان کے مسائل حل بھی کر دیتے ہیں ایک دن جب صاحب بہت خوشگوار موڈ میں تھے تو میں نے جرات کر کے کہا اختر صاحب ایک عرض کروں آپ برا تو نہ مانیں گے عرض نہیں حکم کرو انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا تم جیسی متقی اور دیانتدار کارکن کے کام آنا میری خوش نصیبی ہو گی انہوں نے اتنی بات کہی تو میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں حرف مدعا زبان پر لے آئی میری چھوٹی بہن کی شادی ہے اگر آپ کچھ رقم ایڈوانس دے دیں تو میں آپ کی مشکور ہوں گی کتنی رقم درکار ہو گی ویسے تو ایک لاکھ لیکن آپ جس قدر ایڈوانس دے سکیں دے دیں اور میری تنخواہ سے ہر ماہ قسطوں میں کاٹ لیں بس اتنی سی بات تھی وہ کھل کر ہنسے ارے بھئی میں روز ہی ہزاروں لاکھوں کے چیکوں پر دستخط کرتا ہوں کیا تم کو معلوم نہیں ہے یہ رقم تو بہت معمولی ہے انہوں نے گھنٹی بجا کر اپنے اکاؤنٹنٹ کو دفتر میں بلوا لیا اور مطلوبہ رقم کی ادائیگی کا حکم دیا جب صاحب مجھے ایک لاکھ کا چیک دے رہے تھے تو میرا ہاتھ لرز رہا تھا سوچ رہی تھی کیوں نہ ان کا شکریہ ادا کروں کبھی ان کے یہ الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم جیسی اچھی کارکن کے سامنے اس رقم کی کیا حقیقت یہ الفاظ کسی خوش آہنگ گیت کی مانند میرے کانوں سے ٹکرائے تھے مجھے یقین نہ آتا تھا کہ صاحب مجھ پر اتنے مہربان ہوں گے خوشی سے آنسو نکل پڑے اپنے آنسو صاف کرنے کے لیے جب ہاتھ کھینچا تو احساس ہوا کہ میرا ہاتھ صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ تاہم میں نے ان کے ہاتھ پکڑنے کو نظر انداز کر دیا کہ اپنے منگیتر کے اچھے مستقبل کے لیے مجھے جس شے کی ضرورت تھی وہ مل چکی تھی اور وہ تھی ایک لاکھ روپے کی رقم جذبات سے لبریز آواز سے میں نے جا کر جہاں زیب کو مطلع کیا کہ مبارک ہو تمہاری مراد پوری ہوئی ہے صاحب نے رقم ایڈوانس تنخواہ کے طور پر عنایت کر دی ہے لیکن میں نے ان کو بتایا ہے کہ چھوٹی بہن کی شادی کے لیے رقم چاہیئے لہذا تم یہاں کسی سے اس معاملے کا تذکرہ مت کرنا رقم ملتے ہی جہاں زیب نے پر لگ کے ملازمت سے استعفیٰ دے کر وہ جانے کی تیاری میں لگ گیا جاتے وقت وعدہ کیا کہ چند ماہ کے بعد اندر اندر اس رقم کو لوٹانے کی کوشش کرے گا جہاں زیب کی جدائی سے افسردہ تھی پھر بھی خوش تھی کہ اس کی آرزو پوری ہو رہی تھی اس کے جانے کے بعد میں خود کو دفتر میں تنہا تنہا محسوس کرنے لگی بیرون ملک جا کر اس نے دو بارہ فون پر بات کی اور کہا کہ کچھ قانونی دشواریاں آڑے آ رہی ہیں لیکن فکر نہ کرو جلد اچھی نوکری مل جائے گی اب مجھے جہاں زیب کے بارے میں تفکرات نے گھیر لیا لیکن اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ صاحب نے اگلے روز زیادہ کام کا بہانہ بنا کر میری میز اپنے کمرے میں رکھوا لی آفس ٹائم کے بعد بھی وہ کوئی نہ کوئی فائل کھول کر میرے آگے رکھ دیتے تھے کہتے یہ ضروری کام ہے کافی دنوں سے رکے ہوئے تھے ان کو نمٹانا ہے فکر مت کرو تم کو اوور ٹائم مل جائے گا انہوں نے یہ روز کا معمول بنا لیا مجھے کافی دیر ہو جاتی لیکن وہ ڈکٹیشن دیئے جاتے کہتے گھبراؤ نہیں میرا ڈرائیور تم کو تمہارے گھر چھوڑ آئے گا ادھر یہ مسئلہ تھا ادھر جہاں زیب نے رابطہ ختم کر دیا خدا جانے اس پر کیا بیت رہی تھی شاید وہ قانونی طریقے سے نہ گیا تھا سو طرح طرح کے خیالات میرے دل میں آتے تب سوچتی اے کاش میں اسے لاکھ روپے صاحب سے قرض مانگ کر نہ دیتی تو آج اس مصیبت میں نہ پھنستی جہاں زیب کو گئے ایک سال گزر گیا اس نے مجھ سے تو کیا اپنے گھر والوں سے بھی رابطہ ختم کر دیا ادھر ڈرائیور کی بجائے صاحب خود مجھے گھر چھوڑنے کے لیے جانے لگے راستے بھر ادھر ادھر کی باتیں کرتے جاتے اور میں ہوں ہاں کرتی جاتی میری سوچ میرے خیالات میری روح نہ جانے کہاں ہوتے تھے ان سے انکار نہ کر سکتی تھی ان کی مقروض تھی وہ میرا بہت وقت لے لیتے تھے جس سے تھک جاتی سر دکھنے لگتا تھا ایک روز مغرب تک انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بٹھائے رکھا جو کاغذات پہلے سے ٹائپ شدہ اور درست تھے دوبارہ لکھواتے رہتے جب مغرب کے بعد مجھے گھر چھوڑنے چلے تو راستے میں جانے کیا کہا کہ میں سن نہ سکی میرا ذہن جیسے سویا ہوا تھا ایک جگہ گاڑی کو بریک لگا تب چونکی ایک شاندار ہوٹل کے احاطے میں گاڑی کو بریک مار کر روک دی تھی صاحب یہ کہاں لے آئے ہیں یہ میرا گھر تو نہیں ہے وہ برہم ہو کر بولے لڑکی جب پوچھا تھا کھانا کھاؤ گی تو تم نے کہا کہ ہاں اب یہاں پہنچ گئے ہیں تو اور بات کر رہی ہو کہیں تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے میں ان کی ایسی ڈانٹ سن کر سہم گئی اور مزید ان کی خفگی کے خوف سے گاڑی سے اتر کر ان کے پیچھے چل دی انہوں نے کھانا منگوایا میں نے خوف سے چند لقمے زہر مار کیے وہ مسلسل میرے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے تحتی سے کہا تمہاری یہ غیر حاضری دماغی کسی روز ضرور مجھے ذلیل کرا دے گی میں سمجھ رہی تھی یہ سب کچھ میری غلطی ہے جبکہ مجھ سے پوچھ کر وہ یہاں لائے ہیں میں بے وقوف یہ نہ سمجھ سکی کہ باس نے قرضہ مجھے بغیر مطلب کے نہیں دیا ہے میں احسان مندی کے جال میں جکڑی ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور وہ مجھے ڈائننگ ہال سے ہوٹل کے کمرے میں لے آئے۔ تب بھی نہ سمجھی کہ ان کا یہاں لانے کا کیا مقصد ہے انہوں نے بڑی منصوبہ بندی سے کام لیا تب میرے لئے واپس کے سب در بند ہو چکے تھے اس واقعے کے بعد میری سمجھ میں اچھی طرح یہ بات آ گئی کہ یہ مطلب کی دنیا ہے اور کوئی کسی کی مدد بے غرضی سے نہیں کرتا ہر کام کی قیمت چکانی پڑتی ہے اگلے روز میں نے ملازمت چھوڑ دی کچھ دن بعد نوکری مل گئی میری عزت جو خاک میں مل گئی تھی وہ واپس نہ مل سکی عرصہ تک جہاں زیب کے لوٹ آنے کا انتظار کیا کبھی اس کی راہ تک رہے تھے لیکن وہ نہ جانے کس سرزمین کو پرواز کر چکا تھا کہ پھر نہ لوٹا ایک دن وہ آیا کہ اسے میری یاد نہ رہی تھی مجھے بھی اس کی آرزو نہ رہی جس طوفان کے ڈر سے میں نے اس کے مضبوط بازوؤں میں پناہ چاہی تھی بیچ منجدھار وہ پتوار بھی چھوٹ گئے اور میں غربت کے سمندر میں پوری طرح ڈوب کر غرق ہو گئی میرے لئے زندگی اب ایک پھٹی ہوئی روح کی مانند تھی ایک ایسی کٹی پتنگ جس کو کوئی بھی دست دراز کر کے لوٹ سکتا تھا یہاں ایک احترام کیا چاروں طرف اختر ہی اختر تھے کبھی میں نے دوسری جگہ ملازمت کا ارادہ بھی رد کر دیا اور گھر بیٹھ گئی بہنوں کی شادیاں ہو گئیں بھائی کو بھی اچھی نوکری مل گئی والدہ نے اس کا گھر آباد کر دیا ایک میں ہی عمر بھر کے لیے کانٹوں بھری زندگی سے نباہ کرنے کو باقی رہ گئی تھی اب گھر بسانے کو خواب بھی ایک انہونا سا خیال لگتا تھا کچھ رشتے آئے دل ان کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا تبھی خود کو درس قرآن دینے کے وقف کر لیا اماں کب کی وفات پا گئی ہیں اور میں محلے کی بچیوں کو قرآن پاک پڑھا کر سکون حاصل کرتی ہوں اور سارے محلے والے مجھے باجی درس والی کہتے ہیں۔

افطار پارٹی

صندل شہزاد

اماں بہت پیاس لگ رہی ہے افطار میں میں شربت بنا دینا۔" آج پہلا روزہ تھا گرمی کی شدت معمول سے کہیں زیادہ تھی انسان کیا حیوان کیا سبھی اکتائے بیٹھے تھے شاہ خاور کا غصہ عروج پہ تھا وہ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے جن کے لیے زندگی کی آسائشوں کی بجائے زندہ رہنا اہم تھا جن کے روز و شب کا تمام تر محور دو وقت کی روٹی تھا علی کا باپ معمولی مزدور تھا ایسے طبقے میں محض عبادت اپنے کنبے کے لیے دو وقت کی حلال روٹی کمانا ہی ہوتا ہے علی اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا ان کا گھرانہ نہایت کسمپرسی مگر سفید پوشی میں جی رہا تھا یوں تو ان کا سارا گھرانہ ہی بہت صابر تھا افطار میں ابھی مزید ساڑھے تین گھنٹے رہتے تھے علی پیاس کی شدت کے باعث متواتر عالیہ نے چینی کے خالی ڈبے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور اٹھ کر چٹی مٹی کے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا تھوڑے سے مرتبان کے پاس آ کھڑی ہوئی اس مرتبان میں وہ اپنی چھوٹی موٹی بچت رکھا کرتی تھی اس نے ڈھکن اٹھا کر مرتبان کے اندر جھانکا تھوڑی سی ریزگاری کچھ سکے مرتبان کے پیندے میں پڑے تھے اس نے وہ روپے اٹھائے علی کی انگلی تھامتی چادر اوڑھتی باہر نکل گئی دکان پر پہنچ کر اس نے آدھ کلو چینی تلوا لی مگر پیسے دیتے وقت پیسے کم پڑ گئے "ارے کیوں بھیا کل تک تو آدھ کلو کا یہی دام تھا" وہ شرمندہ ہوتی گویا ہوئی" آج سے رمضان شروع ہوا ہے باقی چیزوں کے دام بڑھ گئے ہیں "علی نے معصومیت سے پوچھا مگر وہ نام نہاد مسلمانوں، جن کا مقصد رمضان میں صرف دھیاڑیاں لگانا ہوتا ہے کے متعلق بتا کر اس کا دل خراب نہ کرنا چاہتی تھی سو خاموشی سے چلتی رہی۔ ہمارے گھر آج افطار کی دعوت ہے خوب مزے مزے کے پکوان بنیں گے تمہارے گھر کیا پکے گا۔ سوکھی اسامہ اپنے دو منزلہ پکے بنے مکان کی چھت پر سے بچا کے کچے مکان کے صحن میں جھانکتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں "روٹی اور چٹنی" بولا جہاں علی صحن کے ایک طرف لگے پودینے کے پتے توڑ رہا تھا تاکہ ان کو کوٹ کر سالن بنایا جا سکے۔ جوابا وہ سنی ان سنی کرتا اندر چلا گیا۔ علی نہایت صابر اور حساس بچہ تھا جو اپنے ماں باپ کی مجبوریوں کی اچھی طرح سمجھتا تھا اسی لیے کبھی کسی مہنگی چیز کے لیے ضد نہ کرتا تھا۔ مگر خود بیٹھا کڑھتا رہتا۔ جب عالیہ کمرے نے داخل ہوتی تو اسے گرمی میں پسینے میں شرابور بیٹھے دیکھا۔ کیا ہوا علی۔ وہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے بولی اماں اللہ میاں نے ہمارے ساتھ ناانصافی کیوں کی ہمیں کیوں دولت نہیں دی اور اسامہ لوگوں کو کیوں اتنی دے دی کہ وہ اتراتے پھرتے ہیں اور ہم سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتے۔ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو جھلملاتے دیکھ کر عالیہ کا دل کٹ کر رہ گیا اس کا بس چلتا تو وہ ہفت اقلیم کی دولت اپنی اولاد کے قدموں میں ڈال دیتی مگر وہ مجبور تھی تقدیر کے لکھے پر اس کا بس نہ تھا۔ بیٹا اللہ میاں تو اپنے سب بندوں سے بہت محبت کرتے ہیں وہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے۔" اس نے علی کو بہلانا چاہا۔ تو پھر ہمارے پاس اسامہ لوگوں جیسا بڑا گھر اور اچھے اچھے کپڑے مزیدار کھانے کیوں نہیں ہیں۔ وہ بے صبری سے اگلی بات کاٹ کر بولا۔ علی بیٹا اللہ میاں ہماری آزمائش لیتے ہیں کسی کو آسائشیں دے کر آزماتے ہیں تو کسی کو بھوکا رکھ کر آزماتے ہیں یہ دنیا تو صرف امتحان گاہ ہے بیٹا اگر آپ تھوڑا کھا کر بھی صبر شکر ادا کرو گے تو آخرت میں اللہ بہت بڑا انعام دیں گے جنت جہاں دنیا جہان کی ہر نعمت پائی جاتی ہے۔ وہ مضبوط لہجے میں بولی علی کو لگا جیسے اسے کامیابی کی کنجی مل گئی ہو وہ اٹھا اور وضو کر کے ظہر ادا کیا اس کا سائرن ہوا تو وہ تینوں نفوس دسترخوان پر آ بیٹھے جس پر دکھی روٹی چٹنی اور سادہ پانی کا جگ دھرا تھا۔ کی نماز ادا کرنے چلا گیا اس نے افسردگی سے علی کو دیکھا جس کا آج پہلا روزہ تھا ساتھ والے گھر سے انواع و اقسام کے کھانوں کی خوشبو آ رہی تھی کیا کیا ہوا جاتا اگر وہ لوگ آدھے شہر کو کھلانے جانے والی اس پرشکوہ دعوت میں اپنے غریب بھائی کو بھی بلا لیتے ایک دن میرا بیٹا اچھا کھانا کھا کر خوش ہو جاتا۔ حماد نے بھائی کے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر علی کے معصوم چہرے کو حیرت سے دیکھا جہاں کوئی ملال نہ تھا بلکہ روزہ رکھنے کی خوشی اور دنیا جہان کی طمانیت رقم تھی۔ اور وہ رغبت سے کھانا کھانے میں مصروف تھا اسکے چہرے کی خوبصورت مسکراہٹ انکو بھی سکون دلا گئی کیونکہ وہ جانتے تھے رمضان کا مقصد اچھا کھانا کھا لینا یا امارت کا چرچہ کرتی دعوتیں نہیں بلکہ صبر و قناعت اور ایک دوسرے کا احساس کرنا ہے۔

(افسانہ) تحریر کا نام: "عید لائی ساتھ تمہارا"

رائٹر کا نام: عائشہ انصاری

آج چوتھا روزہ اور گرمی پورے جوبن پر تھی۔ سڑکیں سنسان گلیاں ویران کہیں کوئی اکا دکا لوگ نظر آ رہے تھے اور آج اس کا انٹرویو تھا وہ جیسے تیسے آفس پہنچی تھی۔ اسے یہاں بیٹھے ڈھائی گھنٹے ہو گئے کہ پی اے نے اس کا نام پکارا۔ وہ فوراً اٹھ کر آفس میں داخل ہوئی۔ گلاس ڈور دھکیلتے ہی اس کے وجود پر اے سی کی ٹھنڈک پھوار بن کر پڑی تو وہ ایک دم پرسکون سی ہو گئی۔ آفس میں بڑی سی ٹیبل کے پیچھے تین نفوس اپنی چئیر پر بیٹھے اس دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ وہ سمجھ گئی مگر اس نے آج سوچ لیا تھا۔ وہ چپ نہیں رہے گی۔ اجازت ملنے پر ان کے سامنے بیٹھ چکی تھی۔ "جی امس اثمل حیدر آپ کیا سوچ کر اس کمپنی میں جاب کے لیے آئی ہیں؟" درمیانی عمر کا شخص تھا جس کے ہر انداز سے غرور ٹپک رہا تھا۔ اس کے جملے پر چوٹ کی گئی۔ وہ غصہ ضبط کرتی فائل ان کے سامنے کر دی۔ اس نے MCS اور کچھ کورسز کر رکھے تھے۔ وہ ایک لائق اور قابل لڑکی تھی۔ امی جان نے اس کو سینڈ کرنے میں بھرپور مدد کی تھی۔ ابا کی وفات کے بعد انہوں نے تینوں بچوں کو محنت کر کے اچھا پڑھا لکھا دیا تھا۔ اثمل حیدر بڑی تھی۔ "اپنی قابلیت" تعلیم اور اعتماد کو سوچ کر"۔ وہ اعتماد اور فخر سے بولی تھی۔ اسکے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ دائیں طرف بظاہر لیپ ٹاپ پر کام کرتا شخص پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اب اس کا مکمل جائزہ لیا، سیاہ راؤنڈ آنکھیں ستواں ناک، صاف رنگت کسی بھی مصنوعی رکاوٹ سے بے نیاز چہرہ اسے معزز بنا رہا تھا۔ وہ اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ "انٹر یسٹنگ! لیکن جاب کے لیے صرف Qualification اور اعتماد ہی نہیں Personality بھی خاصی ہونی چاہیے۔ You Got It فائل واپس اس کی طرف بڑھا دی گئی۔ بائیں جانب بیٹھے شخص نے پہلو بدلا تھا۔ جو عمر میں زیادہ تھا مگر ان کا حلیہ اور انداز انہیں عمر سے کم دکھا رہا تھا۔ "لیسن امس اثمل حیدر اگر آپ اپنا گٹ اپ درست کر لیں تو ہم سوچ سکتے ہیں آپکی C.V میں نے دیکھ لی تھی۔ ریکارڈ اچھا ہے۔۔۔۔" شائستگی سے لہجے میں کہا گیا۔ "معذرت کے ساتھ مگر ہر انسان اپنی مرضی میں آزاد ہے، یہ انکار کا کوئی جواز نہیں بنتا سر۔ وہ لہجے کی تلخی کو رد کرتی نرمی سے گویا ہوئی۔ "آپ جا سکتی ہیں، ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔ درمیان والے شخص نے حتمی انداز میں کہہ کر پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ "بیٹی۔۔۔۔ سر آپ کا روزہ نہیں ہے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ مقابل کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی پھر اسکی جگہ غصے نے لے لی۔ "and Leave! Stop It"۔ اس کے انداز پر وہ سہم کر کھڑی ہوئی۔ وہ آنکھیں مسلسل اسے دیکھ رہی تھیں مگر لب خاموش تھے۔ وہ کچھ سوچ کر دروازے سے پلٹ آئی۔

Actully آپ کی پرابلم یہ ہے کہ آپ لوگ تعلیم سے زیادہ ظاہر کو ترقی دیتے ہیں۔ ایک مشورہ دوں گی مارکیٹ میں نکل جائیں بہت سی آپکو آپ کے "معیار" کی مل جائیں گیں۔ ہم غریبوں کو جاب ملنا مشکل ہے جب تک آپ جیسے ظاہر پرست باس بیٹھے ہیں۔ ہماری Qualification کوئی معانی نہیں رکھتی، تعلیم کو تو بس اب مذاق سمجھا جاتا ہے۔ ملک میں مغربی ماحول رائج کر کے غریب پڑھی لکھی شریف النفس عورتیں گھر میں بیٹھی رہ گئی ہیں۔ دوسرے ممالک کے نقش قدم پر چل کر ترقی چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ خدارا میرے لہجے میں نہیں بلکہ آپ کے دماغوں میں فتور ہے۔ اور ان صاحب کو کیا گھورنے کے لئے بٹھا رکھا ہے۔ ہم جیسوں کو تو بخش دیں۔ وہ نان سٹاپ بول رہی تھی۔ اس کی نظروں کی تپش وہ مسلسل نوٹ کر رہی تھی۔ وہ اچانک افتاد کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کے اس طرح کہنے پر گڑبڑا گیا۔ وہ رکی نہیں تھی ان کو تکس دیکھا کر فوراً باہر نکل گئی۔ وہ کچھ بھی کہہ نہ سکا نہ روک سکا۔ اس کا دل چاہا روک لے مگر۔۔ "پریشان نہ ہو بیٹا نوکری مل جائے گی۔" وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی اماں نے اسے دلاسہ دیا تھا ساتھ ساتھ پنکھی سے ہوا دے رہی تھیں۔ "پچھلے دو مہینوں سے دفتروں کے دھکے کھا رہی ہوں۔ سوچا تھا عید سے پہلے جاب مل جائے گی تو آپ سب کے لیے کچھ شاپنگ کر لوں گی۔ وہ افسردگی سے گویا ہوئی۔ "ویسے امی جان میں دل کا غبار نکال کے آئی ہوں آج، مزہ آ گیا۔ بیچارے منہ تکتے رہ گئے۔۔۔ اس نے مزے لے کر بتایا تھا وہ بھی مسکرا دیں۔ "اچھا کیا سنا آئی ہو؟" پنکھی مسلسل جھلا رہی تھیں۔ "بس جو دل میں آیا میں بولی گئی۔۔۔ لوگ اتنی بڑی بڑی امارتیں تو بنا لیتے ہیں مگر دل کے کم ظرف اور چھوٹی سوچ کے مالک، بس اپنا نفع ہی چاہتے ہیں۔ مغربی طریقہ اپنا کر اوپن مائنڈ سمجھے لگتے ہیں۔ خود کو۔۔۔ ہوں" آج وہ بہت تھک چکی تھی مایوسی سی چھا گئی تھی۔ "کیا ہو گیا ہے اثمل۔۔۔ چلو چھوڑو ان باتوں کو کچن میں آؤ میرے ساتھ، افطاری کا ٹائم ہونے والا ہے "امی جان اس کا دھیان بٹانے کے لیے کہا اور کچن میں چلی گئی۔ وہ بھی ان کی تقلید میں چل دی۔۔۔۔ آج عید تھی وہ خوش رہنے کی کوشش کر رہی تھی اس نے بائیو کلر کا پرانا سوٹ پہن رکھا تھا اس کے ساتھ کانچ کی چوڑیاں اور کانوں میں ٹاپس پہن لیے، بالوں کی پونی ٹیل بنا رکھی تھی۔ اس کے باوجود وہ اچھی لگ رہی تھی۔ وہ ایمل کے بال بنا رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ "کون" دور سے آواز لگائی وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی پھر دروازہ کھول دیا۔ سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر بے یقینی سے آنکھیں پھیلائی۔ "کیا میں اندر آ سکتا ہوں" وہ پوچھ رہا تھا چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ "جی۔۔۔ وہ۔۔۔ آپ کون؟" وہ انجان بنی حیرت اسکے چہرے پر واضح تھی۔ "حاذق مجتبٰی۔۔۔ آپ کو عید مبارک کہنے آیا ہوں باقاعدہ تعارف کے ساتھ "چہرے پر شرارت تھی انداز ایسا کہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ "کیا اب بھی اندر نہیں آنے دیں گی" اثمل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیا کرے امی جان گھر پر نہ تھی۔ وہ اسے اندر لے گئی۔ "آپ بیٹھیں میں امی جان کو ساتھ والے گھر سے بلا کر لاتی ہوں۔ "اسے سٹنگ روم میں بیٹھا کر وہ جانے لگی۔ "وہ کنفیوز ہو رہی تھی۔ اس سے یہ بھی نہیں پوچھا وہ یہاں کیوں اور کیسے آیا ہے۔ "نہیں پلیز میں ان سے بعد میں بات کر لوں گا بہتر ہے پہلے آپ سے بات ہو جائے۔ "اس کے انداز پر ٹھٹک گئی آخر یہ بندہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ "جی مگر۔۔۔ یعنی میں آپکا یوں آنا سمجھی نہیں!" وہ ابھی تک حیرت میں تھی "اس دن کی طرح آپ غصے میں تو نہیں آئیں گی میری بات سن کر۔۔۔" وہ اجازت طلب کر رہا تھا۔ انداز شیریں۔ "آپ کچھ بولے گے تو مجھے سمجھ آئے گی کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں!" وہ ابھی سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ "میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں" گویا دھماکا کیا ہو جیسے۔ "کیا۔۔۔!" فلک شگاف چیخ کے ساتھ وہ اپنی جگہ سے اُچھل کر کھڑی ہوئی۔ "حاذق مجتبٰی بھی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "آپ کی ہمت کیسے ہوئی یہ سب کہنے کی۔۔۔ آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو۔۔۔ جاب تو دی نہیں جاتی چلے ہیں شادی کرنے۔۔۔ مذاق بنانے آئے ہیں میرا یہاں۔۔۔۔" وہ ایک دم شروع ہو گئی۔ اس کی باتوں سے وہ محظوظ ہوا۔ "سانس لے لیں۔۔۔" وہ مسکرایا۔ "تحمل سے بات سنیے زارا وہ کہتے ہے نا پہلی نظر کا عشق بس وہی ہو گیا ہے آپ سے۔ میری ماما میری شادی کے پیچھے پڑی ہیں اور مجھے اب تک میری آئیڈیل نہیں ملی تھی مگر آپ سے مل کر لگا میری منزل آ گئی "will yyou be my destiny? حاذق نے اتنا صبر صرف عید کے دن کے لیے کیا تھا آج وہ اس کی عید کی مبارک اور پرپوز کرنے آیا تھا۔ "مگر۔۔۔ میں۔۔۔" اسے سمجھ نہیں آیا کیا کہے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو رہی تھیں۔ "اثمل بیٹا۔۔۔ کون آیا ہے؟" امی جان نے باہر گاڑی کھڑی دیکھ لی تھی تو سٹنگ روم میں داخل ہوتے پوچھا گیا۔ "اسلام وعلیکم!" اس سے پہلے وہ کچھ کہتی حاذق مجتبٰی نے سلام کے ساتھ اپنا تعارف کرایا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ان سے گھل مل گیا تھا۔ اثمل جاؤ اپنے پاس کے لئے کچھ کھانے کو لے کر آؤ" وہ اٹھ کر چلی گئی۔ حاذق مجتبٰی نے اثمل حیدر کی آنکھوں کا اقرار پڑھ لیا تھا اب آگے منزل آسان تھی"

مختصر سٹوری

مس بچوں کو معمول کا لیکچر دے رہی تھی "لیکن اگر والدین بچوں کی کوئی خواہش پوری نہ "والدین کی نافرمانی سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ کریں تو پھر؟" ایک بچے نے اعتراض کیا "اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ والدین اپنی اولاد کا کبھی برا نہیں چاہتے" استانی نے اسے دوسری مس کے لہجے میں؟ "تو پھر اب تم کیا کرو گی" یا رای نہیں مان رہی" بریک ہوئی تو وہ سٹاف روم میں چلی آئی "مطمئن کیا میں نے آخری راستہ ڈھونڈ لیا ہے میں اسکے ساتھ کورٹ میرج کرا لو نگی" وہ ضدی لہجے میں بولی" تجسس لئے تھا۔

ماہ وش طالب، لاہور

حوصلہ افزائی کرنے والے دوستوں کے نام

عدیل بٹ، دانش انقلابی، سر ندیم، حاجی عدیل صاحب، ٹیپو سلطان، عامر وکیل جٹ۔ بلال احمد قبولہ، محمد اسماعیل صاحب ساہیوال، خضر حیات ساہیوال، منیشم نزیر ڈھکو ساہیوال، عاقب جاوید مقبل ساہیوال، آصف ظفر ملتان، عاصم علی کنول منڈی بہاؤالدین، علی شان ٹھینگ موڑ قصور، لاڈو جٹ ساہیوال، نصراللہ شہزاد ساہیوال، حنا حجرہ شاہ مقیم، مہر رضوان احمد ساہیوال، ارم بہاول نگر، ماسٹر محمد حنیف ساہیوال

شاعری انچارج
آصف جاوید زاہد: 0304-6552827
منظور اکبر تبسم: 0345-3487779

منتخب اشعار

مجھ پر تم ڈھا گئے میری ہی غزل کے اشعار
وہ پڑھ پڑھ کے کھو گئے کسی اور کے خیال میں
افضل آزاد ساہیوال

☆☆☆

خود کو میرے ہی دل میں چھوڑ گئے ہو جانی
تم کو تو اچھی طرح بچھڑنا بھی نہیں آتا
عباس جانی ساہیوال

☆☆☆

ہم چپ ہیں تو چپ ہی رہنے دو ہمیں اگر
ہم ضد پہ آئے تو زمانے سے چھین لیں گے تمہیں
رمضان تبسم پری

☆☆☆

یہ نہ کہہ کہ سب مقدر کی بات ہے جگر
میری بربادیوں میں تیرا ہاتھ شامل ہے
امتیاز عاصم ہڑپہ

☆☆☆

لوٹ آ تیرے جانے سے سب بہاریں لوٹ گئیں
اب تو پیار ہی بچا ہے تجھے یاد کرنے کے لیے ساتی
مسعود علی بورے والا

☆☆☆

بنا لو اسے اپنا جو تمہیں چاہتا ہو خدا کی قسم
بڑی مشکل سے ملا کرتے ہیں چاہنے والے
داؤد احمد نیازی آف بورے والا
0312-6360490

☆☆☆

کاش کے وہ لوٹ آئے مجھ سے یہ کہتے ہوئے
تم کون ہوتے ہو مجھ سے بچھڑنے والے
حنا حجرہ شاہ مقیم

☆☆☆

اپنے سامان کو باندھے ہوئے اس سوچ میں ہوں
جو کہیں کے نہیں رہتے وہ کہاں جاتے ہیں
ارم شہزادی بہاولنگر

☆☆☆

کاش کے تو میری آنکھوں کا پانی بن جائے جاوید
میں کبھی رو نہ سکوں تجھے کھونے کے ڈر سے
عاقب جاوید ساہیوال

☆☆☆

رابطے ٹوٹنے سے محبت ختم نہیں ہوتی
کہتا AZ ہے
لوگ یاد تو انہیں بھی کرتے ہیں جو دنیا چھوڑ جاتے ہیں
آصف جاوید زاہد ساہیوال

☆☆☆

۔۔۔محبتوں میں حساب و کتاب کون کرے
!۔۔۔وہ یاد آتا ہے اور بے حساب آتا ہے
کرن۔۔۔کراچی

☆☆☆

جانے کیا تھان کے اٹھتا ہوں نکلنے کے لیے
جانے کیا سوچ کے دروازے سے لوٹ آتا ہوں
مریم۔۔۔کراچی

☆☆☆

کس قدر ہو گا یہاں مہر و وفا کا ماتم
۔۔۔ہم تیری یاد سے جس روز اتر جائیں گے
رویا علی۔۔۔اسلام آباد

☆☆☆

میں عشق کا اسیر تھا۔۔۔وہ عشق کو قفس کہے
کہ عمر بھر کے ساتھ کو۔۔۔وہ بدتر از ہوس کہے
میں کوئی پینٹنگ نہیں۔۔۔کہ اک فریم میں رہوں
وہی جو من کا میت ہو۔۔۔اسی کے پریم میں رہوں
تمہاری سوچ جو بھی ہو۔۔۔میں اس مزاج کا نہیں
مجھے وفا سے بیر ہے۔۔۔یہ بات آج کی نہیں
فاطمہ حسینی۔۔۔کراچی

☆☆☆

یہ قیام کیسا ہے راہ میں۔۔۔؟
تیرے ذوقِ عشق کو کیا ہوا۔۔۔؟
!!!۔۔۔ابھی چند کانٹے چبھے نہیں
۔۔۔تیرے سب ارادے بدل گئے
زارا خان۔۔۔اسلام آباد

☆☆☆

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا
انجد کی کوروٹانہ

☆☆☆

اگر کسی سے بچھڑنا اتنا آسان ہوتا دوستو
تو جسم سے روح لینے فرشتے کبھی نہ آتے
حنا ارشی ڈسکہ

☆☆☆

یادیں انہی کی آتی ہیں جن سے کوئی تعلق ہو
ہر شخص محبت کی نظر سے دیکھا نہیں جاتا
محمد عامر مانا موڑ

☆☆☆

کسی سے پہلے کوئی رشتہ جوڑا نہیں کرتے
ملائیں ہاتھ تو عمر بھر چھوڑا نہیں کرتے
ندیم سخاوت مانگا منڈی لاہور

☆☆☆

سرور شبیب، رونالہ کوٹ کے نام
لبوں پر تھی بات جو تم سے کہہ نہیں پائے
خوابوں کے بنائے محلوں میں ہم رہ نہیں پائے
شب بھر اس کی یادوں نے اتنا ستایا
دل رویا تیری یاد میں آنسو بہہ نہیں پائے
عدم عباسی، شارکوٹ

☆☆☆

خدا نے عشق میں کیا امتزاج رکھا ہے
وہی جو مرض ہے اس کو علاج رکھا ہے
اے آر راحیلہ، جہلم

☆☆☆

وہ تو جاں لے کے بھی ویسا ہی سبک نام رہا
عشق کے باب میں سب جرم ہمارے نکلے
ماہ نور کنول ۔۔آزاد کشمیر

☆☆☆

نظم

میں نے کیسے ہو؟
بدلے ہو یا ویسے ہو؟
روپ وہی انداز وہی
یا پھر اس میں کوئی کمی؟
ہجر کا کچھ احساس تو ہو گا؟
کوئی تمہارے پاس تو ہو گا؟
میں بچھڑا یہ مجبوری تھی
کب منظور مجھے دوری تھی
ساتھ ہمارا کب چھوٹا ہے؟
آنکھ سے جو آنسو بہتے ہیں
تم کو خبر ہے کیا کہتے ہیں؟
میں نے کہا آواز تمہاری
آج بھی ہے ہمراز ہماری
پھول وفا کے کھل جائیں گے
اک دن ہم پھر مل جائیں گے
رانا سحر، ساہیوال

عید مبارک

گزرے ہر پل سے حسین
وہ ایک پل تھا جب
اتم لے
بولے سے
چپکے سے
میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لئے
بڑے پیار سے
لبوں پہ دلفریب مسکراہٹ سجائے
اور۔
آنکھوں میں شوخ سی شرارت لئے
دھیرے دھیرے میرے کانوں میں کہا تھا۔
عید مبارک میری جان
شاعرہ کنول خان

سانحہ لاہور ۲۸ مارچ ۲۰۱۶

کیا تمہیں ترس نہیں آتا؟
کیا تمہارے گھر میں بچے نہیں؟
سنو ظالم
تمہیں دیکھا تو ہو گا
جب کوئی مارے گا
بے دردی سے
تیرے، بہت ہی پیارے کو
یا تیرے معصوم بچے کو
پھر تو چلائے گا
مگر تیرے ہاتھ تب
کچھ بھی نہ آئے گا
گزرا وقت جو بیت جائے گا
تیرا ضمیر کوڑے برسائے گا
یہ دکھ ستائے گا
یہ روگ تجھے رلائے گا
تو بہت پچھتائے گا
سن ظالم
تو بہت پچھتائے تو
بقلم فاطمہ عبدالخالق فیصل آباد
سانحہ لاہور ۲۸ مارچ ۲۰۱۶

غزل

کانٹوں سے بھر دیا دامن کو میرے
پھولوں کی امید تھی جن سے
بکھیر دیا بکھرے وجود کو میرے
سمیٹنے کی امید تھی جن سے
ہنسنے لگے درد محبت پہ میرے
سنگ رونے کی امید تھی جن سے
زخم دیئے زخموں پہ میرے
دوا کی امید تھی جن سے
ادھورے کر دیئے سارے خواب میرے
تکمیل کی امید تھی جن سے
از قلم بشریٰ الطاف شہر اسلام آباد

غزل

شام کو صبحِ چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی
جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی
یاد آئے تیرے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی
چاند جب دور افق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی
دن شعاعوں سے الجھتے گزرا
رات آئی تو کرن یاد آئی
احمد ندیم قاسمی
انتخاب مسکان احمد

اک لڑکی تھی

اک لڑکی تھی
من موہنی سی
اپنی دنیا میں گم رہنے والی
چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خوش ہونے والی
معمولی لغزشوں سے دلبرداشتہ ہونے والی
پھر اک پون چلی
وہ نازک لڑکی
اپنا دل کھو بیٹھی
ایک شہزادہ کو اپنا سب کچھ مان بیٹھی
وہ شہزادہ بھی اسکا دیوانہ تھا
اسکی اک اک ادا پہ مرتا تھا
وہ اسے دنیا سے چھپانا چاہتا تھا
صرف اپنا بنانا چاہتا تھا
اسکی سب کمزوریوں سے واقف وہ ہوا تھا
پھر اک نئے موسم کا آغاز ہوا تھا
وہ شہزادہ جس کے لیے وہ لڑکی
دین، دھرم، جسم و جاں تھی
پھر وہی اسکے لیے خاص سے عام ہوئی
اس شہزادے نے رفتہ رفتہ
اس پری پیکر کی سب کمزوریوں کو
دل و جاں سے استعمال کیا
اپنی جان کے ٹکڑے کو
خود اپنے ہاتھوں نیلام کیا
آج بھی وہ لڑکی اپنے پیار کو
اپنا خدا مانتی ہے
اپنے شہزادے سے محبت کی بھیک مانگتی ہے
لیکن وہ شہزادہ دنیا کی رنگینیوں میں
گم ہو چکا ہے اور
کہانی کا اختتام زندہ لاش کی صورت ہوا ہے۔
از۔۔۔۔ مون کنول

بچپن

کیا وہ حسین بچپن کا زمانہ تھا
فضا میں قہقہوں کا ساز بجانا تھا
بھاگتے تھے تتلیوں کے پیچھے
اور پاس گڑیوں کا خزانہ تھا
ساتھ تھی سکھیاں سب ہم جولی
اور ہر پل خوشیوں سے یارانہ تھا
چلتی تھی فضا میں بے فکری کی
اور وہ کم عمری کا فسانہ تھا
سنتے تھے کہانیاں شہزادیوں کی
اور خوابوں میں پریوں کا آنا تھا
کرتے تھے شادیاں گڑیوں کی
اور پل میں روٹھنا منانا تھا
بناتے تھے کشتی کاغذ کی
اور خود ہی اس کو پانی میں بہانا تھا
تھام کر ہاتھ ابو کا
اماں کی گود میں چھپ جانا تھا
چڑھ کر بھائی کے کندھوں پر
بے فکری سے ہر غم سنانا تھا
روتے تھے پہروں بیٹھ کر بلا وجہ
اٹھتے کسی سوال کا نہ ڈر اداتھا
گزرا بچپن کا وہ حسین زمانہ
اڑتی تتلیاں اور بہتی ناؤ
سنگت سکھیوں اور ہم جولیوں کی
آنچل سے لپٹی خوشیاں اور سب بے فکریاں
تھی گزرے وقت کی حسین گھڑیاں
اور بچپن کی ڈور سے بندھا خوبصورت پروانہ تھا
اقرا سیف فیصل آباد

نظم

سنو جاناں تمہیں
یاد تو ہو گا
آنکھوں سے ہر
بات کرنا
میرا تم کو
اعتبار کرنا
ساری دنیا چھوڑ کر
صرف میرا انتظار کرنا
یادوں سے میری
دل اپنا آباد کرنا
دکھائی تم ہی دیتے ہو
مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا
اپنا یہ ہی اب مشغلہ ٹھہرا
فقط تنہائی سے بات کرنا
عروج فاطمہ سیدہ ملتان

نظم

کچھ اور زندگی باقی ہے
کچھ اور خواب ضروری ہیں
کچھ ان کہی کی تشنگی میں
کچھ اور جواب ضروری ہیں
کچھ پرانی یادوں کو دفنانا ہے
کچھ اور گلاب ضروری ہیں
کچھ نئی امیدوں سے بچنے کیلئے
کچھ سب سے اجتناب ضروری ہے
کچھ اندھیروں میں ہے مقدر ابھی
کچھ اور چراغ ضروری ہیں
کچھ اور ہے میری منزل ابھی
کچھ اور سراغ ضروری ہیں
کچھ درد کی شدت کم ہے
کچھ اور عذاب ضروری ہیں
کچھ ہوش ابھی قائم ہے
کچھ اور شراب ضروری ہے
از قلم۔ عارف علی سندھو

حمد

آ رہی ہے یہ ہر طرف سے صدا
بخش دے مجھ کو تو ہے میرا خدا
تو احد اور صمد کریم بہت
ہر ہرا اپنے ہنر میں بے یکتا
تیری وحدت کا میں تو ہوں قائل
منکروں کو تو سیدھا راستہ دکھا
دل و جاں خوشبو سے مرے گئے بھر
نام جب بھی لیا تیرا مولا
روح ہے پیاسی عشق تیرے میں
بھیج دے کوئی خضر راہنما
ہے اک اک ذرے میں چھپا تو ہوا
پھر مجھے کیوں نظر نہیں آتا
کئی فرعون میرے پیچھے پڑے
ید بیضا کوئی تجھ کو تھما
جو میں نائب تیرا ہوں دنیا میں
مجھ کو بھی طور کا نور ستہ دکھا
عامر شہزاد تشنہ USA

لڑکی باتیں کرتی ہے

لڑکی باتیں کرتی ہے
اچھی باتیں کرتی ہے
دیکھو بیٹھے بیٹھے ہیں
میٹھی باتیں کرتی ہے
جیسا سندر چہرہ ہے
ویسی باتیں کرتی ہے
ہم دونوں جب ملتے ہیں
چنری باتیں کرتی ہے
اس کے کان کی بالی بھی
میری باتیں کرتی ہے
دنیا کی تو عادت ہے
جھوٹی باتیں کرتی ہے
بھیگے موسم میں اکثر
بھیگی باتیں کرتی ہے
دل کی سونی گلیوں میں
پگلی باتیں کرتی ہے
ارشد کیا وہ سکھیوں سے
ساری باتیں کرتی ہے
ارشد محمود ارشد

نظم

میں جب بھی سوچنے بیٹھتی ہوں
تو ذہن میں بس ایک ہی خیال آتا ہے
تو میرا کچھ بھی نہیں ہے
مگر پھر بھی اپنے اپنے سے کیوں لگتے ہو
تجھے دیکھوں تجھے سوچوں
اور بس تجھ کو ہی چاہوں
اور یہ سوچنا اچھا لگتا ہے
میرے سب ہی جذبے
بس تیرے واسطے
میری باتوں میں تو میرے خیالوں میں تو
میری روح میں چار سو بس تیری خوشبو
پھر یہ سوچ کر ہنس دیتی ہوں خود پر
کبھی سوچنے سے بھی کوئی اپنا ہوتا ہے
جاناں
یہ سب تو کھیل ہے نصیبوں کا
تو میرا کچھ بھی نہیں ہے مگر
پھر بھی اپنے اپنے سے کیوں لگتے ہو۔
شازیہ کریم ڈیرہ غازی خان

میں زندگی کی شام ہوں

نہیں کچھ نہیں مجھ میں خاص
میں تو خام ہوں، میں عام ہوں
یہ جو لفظ ہیں میرے
یہ درد و غم ہیں میرے
جو پڑھ سکو تو پڑھ لو
وہ لفظ سارے
جو میں نے کبھی لکھے نہیں
وہ باتیں ساری
جو کبھی کہی نہیں
کیا تعلق ہے بھلا میرا
ان خوابوں سے
خواہشوں اور سپنوں سے
مجھے کیا لینا ان ہواؤں سے
خوشبوؤں اور موسموں سے
میں تو زندگی کی شام ہوں
اک جلتا دیا ہے نام ہوں میں تو عام ہوں
ہے زندگی گریزاں مجھ سے بہت
مسکراہٹیں، راحتیں
ہیں گریزپا مجھ سے بہت
میرے اپنے بھی
میرے پرائے بھی
تو کیوں فکر ہوں خاص زندگی مجھے راس نہیں
نہیں مجھ میں کچھ بھی خاص نہیں
میں خام ہوں، میں عام ہوں
میں زندگی کی شام ہوں
اک جلتا دیا ہے نام ہوں
میں عام ہوں، میں عام ہوں
شاعرہ:۔ جیا زبیری

﴿اک معصوم سی لڑکی﴾

"اک معصوم سی لڑکی"
وہ کومل پھولوں جیسی ہے
جس کی آنکھوں میں دھنک کے رنگ ابھی
اترے ہیں
جس نے چاہت نگری میں ابھی پہلا قدم ہے
جس نے خوابوں کی دنیا میں ابھی ابھی گھر بنایا
ہے
جس کے لبوں پر ہر پل شرارت مچلتی ہے
جس کی آنکھوں کی چمک ہیروں کی جیسی ہے
جس کی مسکان سب سے انمول ہے
جو غموں سے بلکل انجان ہے
اے میرے مالک
اسکی آنکھوں میں دھنک کے رنگ
چاہت نگری میں اس کے قدم
اور خوابوں کی دنیا میں اس کا گھر
اس کے لبوں کی شرارت
اسکی آنکھوں کی چمک
ہمیشہ شاد رکھنا
اس کے دل کی دنیا صدا آباد رکھنا
مہوش ملک

عید آئی

عید آئی ہماری آئی
سنگ سنگ اپنے خوشیاں لائی
امی، ابو، بھیا، باجی
خوشیاں ہیں، ہم سب کی سانجھی
ابو سب کے جوتے لائے
امی نے کپڑے سلوائے
نازش، نومی، مہندی لائے
صائمہ نے بھی خوب رچائی
رابعہ، مہوش، چوڑیاں لائی
بھائی فرحان نے پینٹ سلائی
دودھ سویاں فرنی کھائی
سب نے مل کر عید منائی
جاوید خان بلوچ شوالہ خوشاب

تیرے گھر تک

تو یہ تجھ سے چاہتی ہے کہ
اب میں تیرا پیار بھلا دوں
میں بھی دل سے چاہتا ہوں کہ
بدنامی سے تجھے بچالوں
اپنے دل سے لیکن جب بھی
تیرا پیار بھلانا چاہوں
جب بھی تجھ کو چھوڑ کے تنہا
غیروں کو اپنانا چاہوں
چھوڑ کے تیرے گھر کا رستہ
دوسرے رستے جانا چاہوں
تب یہ سوچ کر اکثر جاناں
نین میرے بھر آتے ہیں
میرے گھر سے سارے رستے
تیرے گھر تک جاتے ہیں
محمد ارسلان ساہیوال

محبت وفا نہیں کرتی

سنو تم اپنے ہو اس لیے کہتا ہوں
محبت ریت کی طرح ہے
اندھیری آئے تو اڑ جائے
بارش برسی تو بہہ گئی
کبھی صحرا کی ہو کے رہ جائے
سنو تم اپنے ہو اس لیے کہتا ہوں
محبت کبھی وفا نہیں کرتی
تعلق توڑ دیتی ہے
پر جدا نہیں کرتی
محبت مار دیتی ہے
پر خود نہیں مرتی
سنو تم اپنے ہو اس لیے کہتا ہو
تم لوٹ جاؤ یہ راستہ اچھا نہیں
سب دھوکا ہے کوئی سچا نہیں
سنو تم اپنے ہو اس لیے کہتا ہو
محبت وفا نہیں کرتی
انتخاب:۔ لاڈو جٹ ساہیوال

سایہ میرا

کوئی بتائے کہاں ملے گا سایہ میرا
زندگی چل رہی تھی جس کے سہارے
اچانک سے غائب ہو گیا تھا
پتہ نہیں کہاں چلا گیا تھا
بہت ڈھونڈا مگر ملا نہیں سایہ میرا
آنکھیں نہر ہو گئیں ہیں اُس کے جانے سے
دل پہ اُداسی سی چھا گئی ہے اُس کے جانے سے
کوئی بتائے کہاں ملے گا سایہ میرا
زندگی چل رہی تھی جس کے سہارے
میں ڈھونڈتا پھیر رہا ہوں اُس کو دوبارہ
شاید کہ مل جائے کس گلی کسی گھر
ڈھونڈتا ہوں آسمان کے ستاروں میں
پھولوں میں کلیوں میں بہاروں میں
ندی کے گہرے پانی میں پہاڑوں کی قطاروں میں
رات کی تاریکی میں قدرت کے نظاروں میں
کوئی بتائے کہاں ملے گا سایہ میرا
زندگی چل رہی تھی جس کے سہارے
مر نہ جاؤ ظفر میں اُس کے بنا
جی نہ پاؤں گا میں اس کے بنا
یارب ملادے مجھے خاک میں گر نہیں ملنا ہے سایہ میرا
رانا ظفر اقبال ساہیوال
0300-4229969

جی چاہتا ہے کہ کچھ لکھوں۔۔

جی چاہتا ہے کہ کچھ لکھوں
پر سمجھ نہیں آتا کہ کیا لکھوں
شعر لکھوں یا غزل لکھوں
کہانی لکھوں یا افسانہ لکھوں
آغاز لکھوں یا انجام لکھوں
متن لکھوں یا عنوان لکھوں
خوابوں میں لکھوں یا ہوش میں لکھوں
صبح کو لکھوں یا شام کو لکھوں
درد لکھوں یا مزاج لکھوں
احساس لکھوں یا وجہ لکھوں
دوستی لکھوں یا محبت لکھوں
یا رشتوں کی داستان لکھوں
دن رات کے ستم لکھوں
یا دنیا کی بے ثباتی لکھوں
بہاروں کے رنگ لکھوں
یا خزاں کے پتے لکھوں
وصال کی چاشنی لکھوں
یا ہجر کی کرواہٹ لکھوں
زندگی کے اصول لکھوں
یا سپنوں کی آواز لکھوں
کچھ اپنے بارے میں لکھوں
یا دوسروں کی سوانح لکھوں
جی چاہتا ہے کہ کچھ لکھوں
پر سمجھ نہیں آتا کہ کیا لکھوں
(محمد شعیب)

غزل

ابھی سورج نہیں ڈوبا ذرا سی شام ہونے دو
چلا جاؤں گا مجھے ناکام ہونے دو
مجھے بدنام کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہو کیوں
میں خود بدنام ہو جاؤں گا پہلے نام ہونے دو
ابھی مجھ کو نہیں کرنا ہے اعترافِ شکست
میں سب تسلیم کر لوں گا یہ چرچا عام ہونے دو
میری ہستی نہیں انمول پھر بھی بک نہیں سکتا
وفائیں بیچ لینا پر ذرا نیلام ہونے دو
نئے آغاز میں ہی کیوں حوصلہ ہار بیٹھے ہو؟
جیت جاؤ گے سب کچھ ذرا انجام ہونے دو
شیراز احمد ساحر۔ چشتیاں
0304-1628420

تم مجھے مجھ سے ہی لگتے ہو

برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟؟
تم مجھے مجھ سے ہی لگتے ہو،
تیرے لفظ، تیری باتیں
تیرا انداز، تیرا لہجہ۔۔۔
تیرا درد، تیرا غم،
تیرا زخم، تیری آہ۔۔۔
تیری محبت، تیری عبادت،
تیری دیانت، تیری دعا۔۔۔
تیرا جرم، تیرا قصور،
تیرا گناہ، تیری خطا۔۔۔
تیری تنہائی، تیری رہائی،
تیرا روگ، تیری التجا۔۔۔
تیری کسک، تیری تڑپ،
تیری وفا، تیری انتہا۔۔۔
تیری ہار، تیری مات،
تیری جفا، تیری سزا۔۔۔
سب مجھ سا ہی ہے۔۔۔
سنو کہیں۔۔۔
"میں تم تو نہیں؟؟؟"
یا کہیں۔۔۔
"تو میں تو نہیں؟؟؟"
از قلم نادیہ خان بلوچ

نظم

اک بوند برس
اک اشک چھلک
اخاموش نظر
کوئی بات تو کر
دل دکھتا ہے
تو میرے دل پر ہاتھ تو رکھ
میں تیرے ہاتھ پہ دل رکھ دوں
دل درد بھرا
جو اس کو چھوئے
یہ اس سے ملے
اک لفظ محبت بول ذرا
میں سارے لفظ تجھے دے دوں
دل درد سراب کو آب سے بھر
تو میرے خواب پہ آنکھ تو دھر
میں تیری آنکھ میں خواب بھر دوں
اخاموش محبت
ابات تو کر
!!!دل دکھتا ہے۔
سارا خان کراچی

آزاد نظم

اس موڑ سے جاتے ہیں
کچھ سست قدم رستے، کچھ تیز قدم راہیں
پتھر کی حویلی کو
شیشے کے گھروندوں میں تنکوں کے نشیمن تک
صحرا کی طرف جا کر
اک راہ بگولوں میں کھو جاتی ہے چکرا کر
زک زک کے جھجکتی سی
اک موت کی ٹھنڈک سے وادی میں اترتی ہے
اک راہ ادھڑتی سی
چھلتی ہوئی کانٹوں سے جنگل سے گزرتی ہے
اک دوڑ کے جاتی ہے
اور کود کے گرتی ہے انجان خلاؤں میں
اس موڑ پہ بیٹھا ہوں
جس موڑ سے جاتی ہیں ہر ایک طرف راہیں
اک روز تو یوں ہو گا اس موڑ پر آ کر تم
رک جاؤ گی کہہ دو گی
وہ کون سا رستہ ہے۔۔۔؟
گلزار
عطاالرحمٰن۔۔۔۔بکھر

سنو!

بہت مصروف ہو تم بھی
مجھے بھی سچ کہوں تو
بہت سے کام کرنے ہیں
ابھی تشکیک باقی ہے
میری تحقیق باقی ہے
کئی غزلیں ادھوری ہیں
مری ماں کو شکایت ہے
میں کھانا بھول جاتی ہوں
کتابوں کو الگ شکوہ
کہ بے ترتیب رہتی ہیں
اگر تم جانتے ہونا
تمہاری یاد میں گم صم
میں پھروں بے عمل رہ کر
کئی سپنے سجاتی ہوں
تمہارے ہاتھ ہاتھوں میں
میں دھیرے سے دباتی ہوں
سنو! جو فرض ہیں میرے
توجہ سے نبھاتی ہوں
مگر یہ کیا؟
رہی یہ سرد مہری اور بظاہر بے عمل رہنا
کسی کو بھی نہیں بھاتا
گلے سب کے بجا لیکن
فقط اس پہ ہی کیا موقوف ہے
تمہیں جب یاد کرتی ہوں
میں رب کو بھول جاتی ہوں
بس اب اتنی گزارش ہے
تمہیں گر چند لمحوں کی
فراغت ہو
تو کچھ کاموں کو بن سوچے
نہ اتنے جو ضروری ہوں
انہیں تم کل پہ رکھ دینا
میری خاطر چلے آنا
میرا یہ بے عمل رہنا
تمہی موقوف کر جاؤ
مجھے مصروف کر جاؤ
انس۔۔۔۔۔۔پاکستان ٹی:بی

غزل

کوئی آرزو اب بھی مچلتی ہے دل میں
کوئی حسرت اب بھی اٹھتی ہے دل میں
تمہیں پانے کے بعد سب کچھ پالیا ہم نے
جانے پھر کیوں کسک اٹھتی ہے دل میں
حسین نظارے اور دو دور جاتے پنچھی
اکیلے پن کی اک ہر اٹھتی ہے دل میں
نخ بستہ ہوائیں آ کر بدن کو ہیں جلاتی
بڑے جذبات کی گرمی سلگتی ہے دل میں
کوئی تو ایسا موسم ہو تنہائی مرمیتے
تیرے سنگ رہنے کرن چمکتی ہے دل میں
جانے کیوں اکیلے پن سے ڈر ہے لگتا عنبرین
پھر اُس کی یادوں کی لو اٹھتی ہے دل میں
عنبرین اختر لاہور

غزل

میری تنہائی میں یہ عید روتی ہوئی
اک غزل میری سوچوں میں الجھی ہوئی
وہ خیال ہے کہ خواب ہے کوئی
جو میرے اضطراب میں ہے کھلی ہوئی
اے عید پیام کوئی اُن کا بھی لا دے
میری ہر تخلیق ہے ادھوری پڑی ہوئی
کوئی تو روشنی کرے میرے دل میں
اس عید پر بھی میرے دل کی شمع بجھی ہوئی
وہ مہ جبیں میری دسترس سے نکل گئی انجم
جیسے فضا میں خوشبو کوئی بکھری ہوئی
شاعر محمد خاں انجم و، بہاولپور

"دیکھ لینا"

ہم مر جائیں گے اک دن دیکھ لینا
رو دو گے بہت تم اس دن دیکھ لینا
دنیا میں ہیں تو پرواہ نہیں ہماری
چھوڑ جائیں گے تمہیں اک دن دیکھ لینا
آنسو چھپاتے پھرو گے سب سے تم
اتنا ہم یاد آئیں گے دیکھ لینا
کچھ یادیں میٹھی میٹھی سی تم کو بہت ستائے گی
تم خود کو نہ روک پاؤ گے دیکھ لینا
مانا کہ کچھ نہیں میں آج ہم تمہارے لیے
کل تمہارے اک یاد بن جائیں گے دیکھ لینا
میاں ارسلان احمد بہاول نگر

غزل

شہر جلائے جاتے ہوں گے
جشن سنائے جاتے ہوں گے
نیندیں کاٹی جاتی ہوں گی
خواب اگائے جاتے ہوں گے
غیرت کی دیوار کے پیچھے
خون بہائے جاتے ہوں گے
چادر اوڑھی جاتی ہو گی
داغ چھپائے جاتے ہوں گے
آج بھی خوابوں کی قربت پر
پھول چڑھائے جاتے ہوں گے
روز تماشا ہوتا ہو گا
لوگ ہنسائے جاتے ہوں گے
مٹی کی دیواروں پر بھی!
پھول بنائے جاتے ہوں گے
شاعر: صدام فدا (واہ کینٹ)

غزل

کوئی امید جو ہوتی تیرے لوٹ آنے کی
پھر نہ ہوتی ایسی حالت دل دیوانے کی
میں تو ہر حال میں خوش رہنے کی جستجو میں رہا
نہ گئی تیری عادت وہ ستانے کی
زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹ رہا ہوں
نہیں دیتا کوئی دعا بھی مر جانے کی
تیرے سنگ بیتا ہر لمحہ یاد آتا ہے
جب بھی کوشش کی تجھے بھلانے کی
اب تو اکثر یہی سوچتا رہتا ہوں
تجھ کو مانگوں یا مانگوں دعا تجھ کو بھول جانے کی
خدیجہ کشمیری۔ سری نگر مقبوضہ کشمیر

غزل

میں صرف تم سے ہی پیار کرتا ہوں
ساری دنیا کے سامنے یہ اظہار کرتا ہوں
تو اک بار مجھ سے ملنے کا وعدہ تو کر
پھر دیکھ میں تیرا کتنا انتظار کرتا ہوں
تو کہے تو پوری دنیا کو چھوڑ دوں میں
میں کب تیری کسی بات سے انکار کرتا ہوں
تیرے سوا میرے دل میں کوئی نہیں ہے انم
میں اس بات کا دل سے اقرار کرتا ہوں
لکھ دے میری ساری خوشیاں تیرے نام
خدا سے یہی میں آہ و پکار کرتا ہوں
دانش انقلابی سعودی عرب

غزل

مجھے آنسوؤں کی طلب نہیں مجھے زندگی کی تلاش ہے
جسے ڈھونڈ کر بھی نہ پا سکے مجھے پھر اسی کی تلاش ہے
مجھے دشمنوں میں نہ ڈھونڈنا مجھے دوستوں میں تلاشنا
میں محبتوں کا اسیر ہوں مجھے دوستی کی تلاش ہے
میری راہ عزم کی تلاش میں کوئی زندگی کا رفیق ہو
کوئی آنسوؤں کا چراغ دے مجھے روشنی کی تلاش ہے
میں بلندیوں کا ضمیر ہوں میں رفاقتوں کا پذیر ہوں
مجھے نفرتوں کی زمین پر محبتوں کی تلاش ہے
ندیم عباس ڈھکو ساہیوال

غزل

میرے رتجگے میرے دوست ہیں، میری کروٹیں ہیں میری گواہ
تمہیں اس درد کا کیا پتہ، یہ تمہاری نظر میں فضول ہیں
میری ڈائری میرا رازداں، جس میں اس میں کچھ نشانیاں
وہ جو خط تم نے لکھے کبھی، جو دیئے تھے تم نے وہ پھول ہیں
جہاں ہم چلے تھے ساتھ ساتھ، وہ راہیں میری نظر میں ہیں
جو محبتوں کے امین تھے، وہی راستے آج دھول ہیں
جو درخت تھے ہمارے رازداں وہ درخت آج اُداس ہیں
نزہت جبیں ضیاء

غزل

پارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا
حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا
جانے کیوں اب شب ہجراں پر بھی پیار آتا ہے
تیرا غم میری محبت کو کہاں لے آیا
میں تیری بزم سے اٹھ کر بھی تیری بزم میں ہوں
میں نے جب خود کو گنوایا تو تجھے اپنایا
رات کا شکر کہ اے انم کہ دن ہوتے ہیں
تیرے پیکر سے اچٹ آئے گا تیرا سایا
ابر کے چاک سے جب رات ستارے جھانکے
اے میرے بھولنے والے تو بہت یاد آیا
بیچ دوں کیوں اسے اک نان جویں کے بدلے
میں نے جس دل کیلئے ایک جہاں ٹھکرایا
اس توقع پہ کہ شاید کبھی انسان سنبھلے
ہر نئے ظلم نے جینے پر مجھے اکسایا
رمضان تبسم پری ساہیوال

غزل

تیری یادوں کے دیئے بجھ نہیں سکتے
تیرے احسانوں کا بدلہ چکا نہیں سکتے
دل میں سجا رکھا ہے تیرا عکس ہم نے
چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ عکس مٹا نہیں سکتے
تیرے غم کو سینے میں چھپا لیا ہم نے
کتنا درد ہوا دل میں بتا نہیں سکتے
تم لوٹ آؤ واپس یہ ممکن نہیں
لیکن تیری راہوں سے نظر ہٹا نہیں سکتے
چاہے زندگی کتنی حسین ہو
لیکن تیرے بچھڑنے کا غم بھلا نہیں سکتے
سیف الرحمٰن زخمی سیالکوٹ

غزل

ہم بھول جائیں تو آج بہتر ہے
یہ سلسلے قربت کے جدائی کے
میں تیری یاد کو دل میں لیے پھرتا ہوں
0345-3487779

دوست کیا خوب وفاؤں کا صلہ دیتے ہیں

دوست کیا خوب وفاؤں کا صلہ دیتے ہیں
ہر نئے موڑ پر ایک زخم بنا دیتے ہیں
تم سے خیر گھڑی بھر کی ملاقات رہی
لوگ صدیوں کی رفاقت کو بھلا دیتے ہیں
کیسے ممکن ہے کہ دھواں بھی نہ ہو اور دل بھی نہ جلے
چوٹ پڑتی ہے تو پتھر ہلا دیتے ہیں
کون ہوتا ہے مصیبت میں کسی کا
آگ لگتی ہے تو پتے بھی ہوا دیتے ہیں
جن پہ ہوتا ہے بہت دل کو بھروسہ
وقت پڑنے پر وہی لوگ دغا دیتے ہیں
ثریا محمد حسین ملک جھنگ

پنچھیوں کو کہاں پہ جانا ہے

پنچھیوں کو کہاں پہ جانا ہے
یہ شجر ہی تو بس ٹھکانا ہے دکھ
محبت ہمیشہ دیتی ہے
دل کا کہنا بھی کسی نے مانا ہے
اپنے ہاتھوں نہ کرا سے ضائع
زندگی ایک قیمتی خزانہ ہے
جو بتا دے نشان منزل کا بس
اسی راہ گزر پہ جانا ہے
ضبط غم میں حیات گزری ہے
کیا سنبھل کر قدم اٹھانا ہے
کچھ سمجھ میں مرے نہیں آتا
کیوں مخالف مرا زمانہ ہے
وقت رخصت تجھے پتہ ہی نہیں
شہزادہ کتنا رویا کل زمانہ ہے
(شہزاد سلطان کیف، الکویت، بھمبر)

غزل

تیرے عہد وفا کی عہد شکنی پہ
دل اک بار تو شق ہوا تھا
پر اب وہ دن گزر چکے ہیں
نہیں راتوں میں اب وہ بے قراری
اور نہ آنکھوں میں
اداس موسموں کی اجارہ داری
وہ سرد وہ لبوں پر پھیکی ہنسی
جاناں اب کبھی آتی نہیں
کیونکہ میں نے پارہ پارہ ہر دے کو
پر خلوص لوگوں کی چاہت میں سمیٹ لیا ہے
شاعرہ: حمیرا نوشین منڈی بہاؤالدین

غزل

روٹھتے ہیں مناتے ہیں
قسموں قسمیں کھاتے ہیں
دلوں کے ہیر پھیر ہو جاتے ہیں
وقت زمانے بدل جاتے ہیں
پھر روتے ہیں رلاتے ہیں
ہنستے ہیں نا ہنساتے ہیں
سفر میں ساتھ چھوڑ جاتے ہیں
تھکتا ہے جب ایک مسافر
دوسرا مجبوری سے تھک جاتا ہے
کھیل ہیں عشق کے نرالے صاحب
ظاہر ہے وہ جیتا ہے بہت
مگر باطن سے وہ مر جاتا ہے
شاعرہ: زینب ملک ندیم